میرزا ادیب

ننگی دوپہر کا سپاہی

سلام بن رزاق

نیو رائٹرس پبلی کیشنز
۵۹/۱۱، پائپ روڈ، کرلا، بمبئی ۴۰۰۰۷۰

(بہ اعانت مہاراشٹر اردو اکیڈمی)

بار اوّل : دسمبر ۱۹۷۷ء

کتابت : ابراہیم نذیر
سرورق : طارق شرار
طباعت : پراماؤنٹ آفسیٹ پریس بمبئی

قیمت : آٹھ روپے

ملنے کا پتا : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ،

نئی دہلی ۲۵ ، دہلی ۶ ، بمبئی ۳ ، علی گڑھ ۲ ۔

مصنفہ کا پتا : B38/4 ، قریش نگر ، کرلا ، بمبئی ۴۰۰۰۷۰

اس کتاب کا املا ــــ
جناب رشید حسن خاں صاحب کی قابل قدر کتاب "اردو املا" کی روشنی میں لکھا گیا ہے ۔

ترتیب

● البم : پاکستانی ادب (کراچی) ● واسو : تحریک (نئی دہلی) ● پٹّا :
آج کل (نئی دہلی) ● زنجیر ہلانے والے : جواز (مالیگاؤں) ● قصّہ
دیو جانس جدید : شب خون (الہ آباد) ● بیعت : نئے نشانات (مالیگاؤں)
● بجوکا : آج کل (نئی دہلی) ● مکھوٹے : نیا دور (لکھنؤ) ● حمام :
تحریک (نئی دہلی) ● کالے ناگ کے پجاری : اظہار (بمبئی) ● اُس کا بت :
الفاظ (علی گڈھ) ● ایک تکونی کہانی : آج کل (نئی دہلی) ● ننگی دوپہر کا
سپاہی : شب خون (الہ آباد) ● اُس دن کی بات : آج کل (نئی دہلی)
● انجام کار : آج کل (نئی دہلی)

پیش لفظ

انسانی قدروں کی بساط مضحکہ خیز طور پر اُلٹ گئی ہے
وزیر شاہ پر سوار ہو گیا ہے
ہاتھی گھوڑے کہیں کے کہیں جا پڑے ہیں
اور ____
پیادے چاروں خانے چت ہیں

اس بکھری بازی کو دوبارہ کون جمائے ؟
کوئی نہیں جانتا
بازی کہاں سے چلی تھی ،
کہاں تک پہنچی تھی
مگر تعجب ہے لوگ بازی پھر بھی کھیلے جا رہے ہیں
پر اب اس کا کوئی ضابطہ ہے نہ اصول
ساری بازی
کسی پاگل کی سنک کی طرح چل رہی ہے

سلام بن رزاق
5-12-77

انتساب!

'ع' کے نام!

اَلْبم

ہوتا یہ ہے کہ میں جب بھی اس البم میں اپنی تصویر چپاں کرنے کی کوشش کرتا ہوں میری تصویر پر کئی دوسرے چہرے چپک جاتے ہیں۔ یہ چہرے کوئی اور نہیں میرے ہی عزیزوں، رشتے داروں اور دوستوں کے چہرے ہیں۔ جنم جنم کی معصومیت لیے ۔ سفاک چہرے، جن کی خاموش چنگھاڑ سے میرے دماغ کی نسیں چٹخنے لگتی ہیں ۔ ٹکڑے ٹکڑے جوڑ کر ایک پیکر گڑھنے کی کوشش کرتا ہوں ۔ مگر ہوا اس قدر تیز ہے کہ ریزہ ریزہ بکھر جانے کا خوف برابر لگا رہتا ہے ۔ میں اس بدنصیب شخص کی طرح ہوں جو دوڑتے دوڑتے ہانپ گیا ہو مگر سستانے کے لیے جس درخت کے سایے تلے بیٹھا ہے ، اُس کی ساری جڑوں کو کیڑے چاٹ چکے ہیں ۔

مجھے مجھ تک پہنچنے کے لیے ابھی نہ جانے کتنے جہنموں سے گزرنا پڑے گا ۔

اُف، جہنم در جہنم بکھرے ہوئے اپنی ذات کے شیرازے کو سمیٹنا کتنا کرب ناک ہوتا ہے۔

میں اپنے چہرے پر جس چہرے کی آنچ سب سے پہلے محسوس کرتا ہوں، وہ میری بوڑھی ماں کا چہرہ ہے۔ خستہ اور بیمار۔ تھکن اور بڑھاپا اُس کے ریشے ریشے سے عیاں ہے۔ بس کسی بھی دن 'الوداع' کہنے کو تیار بیٹھی ہے۔ تاہم اس کا علاج آج بھی برابر جاری ہے۔ بستی کا کون سا حکیم، ڈاکٹر ہے، جس سے میں نے اس کا علاج نہیں کرایا؟ اب بھی کروا رہا ہوں۔ آج بھی ہر ماہ تیس چالیس روپیوں کی دوا دارو ہو جاتی ہے اس کی۔ پھل فروٹ الگ سے۔ نہیں، اس میں احسان جتانے جیسی کوئی بات نہیں۔ مجھے ان سب کے لیے کرنا ہی کیا پڑتا ہے۔ روزانہ دو تین گھنٹے اوور ٹائم، دن میں چار پانچ جھوٹ اور ایک آدھ موٹے مرغے کی تلاش۔ ہاں یہ سب کیے بغیر تین، ساڑھے تین سو میں کوئی کچھ نہیں کرسکتا۔ میری ماں بھی سب جانتی ہے۔ ابھی پچھلے ماہ جب غیر متوقع طور پر ایک پارٹی سے مجھے دو سو روپے ملے تو گھر میں سب کے لیے کپڑے، بچّے کے لیے مٹھائیاں اور کھلونے آ گئے تھے۔ تین چار روز تک سبھی بہت خوش رہے۔ ماں دوسرے دن، کرم علی شاہ بابا کی درگاہ پر چڑھاوا بھی چڑھا آئی۔ ماں نے وہاں شاید میری کمائی میں برکت کے لیے سچّے دل سے دعا بھی مانگی ہو۔ ماں بیٹے کے لیے سچّے دل ہی سے دعا مانگ سکتی ہے، چاہے وہ جھوٹ کی حمایت میں کیوں نہ ہو۔

وہ تو ایک پُرانا آدرش وادی قصّہ تھا کہ ماں نے اپنے بیٹے کی آستین کے نیچے سو دینار سی دیے اور اُسے سفر پر روانہ کرتے ہوئے تلقین کی کہ ہمیشہ سچ بولنا۔ پھر اُس لڑکے کی سچائی نے ڈاکوؤں کے دل پھیر دیے ——— میری

ماں یہ سب کرے تو کھانس کھانس کر تیسرے ہی دن دم توڑ دے ۔ میں تو جانتا ہوں ۔ ماں کی بیماری موت کی بیماری ہے ۔ میں یہ بھی جانتا ہوں، اس میں اب بات بے بات چڑچڑانے یا کھانسنے کھنکارنے کے سوا کچھ باقی نہیں بچا ہے ۔ مگر کیا کیا جائے ۔ آدمی آخری سانسوں تک زندگی سے چمٹا رہنا چاہتا ہے ــــ ماں کی خدمت سے بھلا کیسے انکار ہو سکتا ہے ۔ اُس نے مجھے دو برس تک دودھ پلایا ہے ۔ میں بھی پچھلے بارہ برسوں سے اُسے دوا پلا رہا ہوں اور ذرا بیزار نہیں ہوا ۔ نہیں ایسی بات نہیں ۔ میں دودھ اور دوا کا موازنہ نہیں کر رہا ہوں، مگر اب کیسے سمجھاؤں ۔ سعادت مندی کے تمغے مفت تو نہیں بٹتے ــ کبھی کبھی آدمی کو ایک بہتر آدمی بننے کی سعادت پانے کے لیے خواہشوں کی کتنی قتل گاہوں سے گزرنا پڑتا ہے ۔

ابھی پچھلی دفعہ میں ماں کے لیے اسٹور سے دوا خریدنے گیا ۔ میڈیکل اسٹور اور وائن شاپ ایک دوسرے سے ملحق تھے ۔ میں بے خیالی میں وائن شاپ میں گھس گیا اور رنگ برنگی بوتلوں پر حریصانہ نگاہ ڈالتا ہوا دواؤں کا نسخہ وائن شاپ کے مینجر کے ہاتھ میں تھما دیا ۔ اُس نے مجھے نیچے سے اُوپر تک گھور کر دیکھا اور اُنگلی سے اشارہ کرتا ہوا بولا ۔

"باجو میں ــــ باجو میں جاؤ ۔"

تب مجھے ہوش آیا اور میں شرمندہ ہو کر وہاں سے پلٹ آیا ۔

اس رات مجھے ٹھیک سے نیند نہیں آئی ۔ عجیب اوٹ پٹانگ خواب دیکھتا رہا ــــ میں ایک لق و دق صحرا میں دوڑتا چلا جا رہا ہوں ۔ پیاس کے مارے میرے حلق میں کانٹے سے پڑ گئے ہیں اور میں کسی تھکے ہارے چوپائے کی طرح زبان نکالے ہانپ رہا ہوں ۔ سامنے پانی کا ایک چشمہ نظر آتا ہے ۔

میں اس کی طرف لپکتا ہوں ۔ مگر چشمے کے قریب پہنچنے سے پیشتر ہی میں گھٹنوں گھٹنوں ریت میں دھنس جاتا ہوں ۔ دھنستا ہی چلا جاتا ہوں ۔

اُس رات میں نے پہلی دفعہ محسوس کیا کہ ماں کی کھانسی میری نیند میں کتنا خلل ڈالتی ہے ۔ ماں کی دوا برابر جاری ہے ۔ میں ناخلف نہیں ہوں ۔ میں نے تہیّہ کرلیا ہے کہ کچھ بھی ہو جائے ۔ میرا اپنا آپ بک جائے ۔ میں آخری لمحوں تک اس کا علاج کراتا رہوں گا ۔ اپنی ماں سے کسے محبّت نہیں ہوتی ، مجھے بھی ہے ۔ محبّت شاید انسان کی آخری مجبوری کا نام ہے ۔ ماں کے چہرے کے ساتھ ایک اور چہرہ جڑا ہوا ہے ۔ اُداس ، مضمحل اور جگہ جگہ سے ٹوٹا پھوٹا ۔ یہ والد مرحوم کا چہرہ ہے ۔ ہاں ، یہ اب اس دنیا میں نہیں رہے — بیماری ؟ کوئی بیماری نہیں تھی ۔ سوائے شراب کے ۔ آخری دنوں میں تو اس قدر پینے لگے تھے ۔ کہ اُن کے پسینے تک سے شراب کی بو آنے لگی تھی ۔ میں والدصاحب کو صرف اِس لیے مہا پرش مانتا ہوں کہ وہ دنیا کے دیگر مہا پرشوں کی طرح اپنی بیوی یعنی میری ماں سے ہمیشہ دُکھی رہے ۔ غالباً اسی دُکھ کو بھلانے کی خاطر وہ بے تحاشا پیتے تھے ۔ مجھے یاد ہے کہ انھوں نے ماں سے ایک دن لڑائی کے دوران میں کہا تھا ۔

"تمھارے گھر سے زیادہ سکون تو مجھے اوشا بائی کے کوٹھے پر ملتا ہے" ۔

اُس دن ماں دن بھر والد کو گالیاں دیتی رہی اور کوستی کاٹتی رہی ۔ گھر میں چولھا بھی نہیں جلا ۔ اُس دن والد نے مجھے ہوٹل میں کھانا کھِلایا تھا ۔

جب والد بسترِ مرگ پر تھے ۔ اُن کے حلق میں آبِ زم زم کے متبرک قطرے ٹپکائے جانے لگے ۔ اُنھوں نے آبِ زم زم پینے سے انکار کرتے ہوئے دو گھونٹ شراب مانگی تھی ۔ میں نے تو چاہا تھا کہ وہسکی کے دو چمچے پلا دوں ۔

مگر برادری کے بزرگوں نے مجھے ڈانٹ پھٹکار کر وہاں سے ہٹا دیا۔ والد کی موت کے تیسرے دن اُن کی رُوح کو سکون پہنچانے کی خاطر پانچ فقیروں کو نیاز کھلائی گئی۔ نیاز میں مرحوم کے من پسند کھانوں کا خاص خیال رکھا گیا تھا۔ کورے برتنوں میں پیٹ بھر کھانا کھلا کر پاجامے کرتے کے لیے چھ چھ گز نیا کپڑا بھی نذر کیا گیا تاکہ وہاں عالمِ بالا میں والد کی رُوح کو اس کا پورا پورا ثواب حاصل ہو۔ میں چپ چاپ یہ تماشا دیکھتا رہا۔ فقیر بار بار اپنی توندوں پر ہاتھ پھیرتے بارک اللہ اور مغفرت اللہ کے نعرے لگا رہے تھے۔ جب وہ حلق تک کھانا ٹھونس چکے اور چھ چھ گز کپڑا بغل میں دبا کر باہر نکلے تو میں لپک کر اُن کے پاس گیا اور دس روپے کا ایک نوٹ پیش کرتے ہوئے انتہائی عاجزی سے ہاتھ جوڑ کر بولا۔

"شاہ صاحب! میرے والد اچھّے کھانوں کے ساتھ شراب کے بھی بہت رسیا تھے۔ یہ چھوٹی سی رقم نذر کرتا ہوں۔ اس کا ایک ایک پیگ لے لیجیے کہ مرحوم کی آخری خواہش یہی تھی۔"

یہ سن کر فقیر بہت خفا ہوئے تھے اور مجھے بہت بُرا بھلا کہا تھا۔ والد نے زندگی میں ہزاروں روپیا کمایا مگر سب اس بے دردی سے اُڑا دیا جیسے سارا روپیا سٹّے ریس میں کمایا ہو۔ میرے لیے ورثے کے نام پر ایک ٹوٹا پھوٹا مکان، مستقل بیمار ماں اور بارہ ہزار رُوپے کا قرض چھوڑ گئے تھے۔ قرض خواہ تو تقاضا کر کر کے اور دھمکیاں دے دے کر ہار گئے۔ البتہ یہ خستہ صورت مکان اور شکستہ حال ماں اب بھی میرے ساتھ ہیں۔

بہ غور دیکھا جائے تو ہم اپنے لیے دس فی صدی بھی نہیں جیتے۔ ہماری نوّے فی صدی زندگی دوسروں کی خواہشوں اور فرمائشوں کا قرض ادا

کرنے میں گزر جاتی ہے۔

ماں کے قول کے مطابق میری شادی اُس کی آخری خواہش تھی۔ ایک فرماں بردار بیٹے کی طرح میں نے شادی کرلی۔ مگر اب اس کی خواہش پوری ہوئے آٹھ برس بیت چکے۔ اُس کی خواہشات کا سلسلہ برابر جاری ہے۔ شاید خواہشیں کبھی ختم نہیں ہوتیں۔

یہ میری بیوی ہے۔ یہ اُس وقت کی تصویر ہے جب وہ اس گھر میں دلھن بن کر آئی تھی۔ گلے کی طرح معصوم نظر آتی ہے نا؟ آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں مگر شاید آپ کو اس کی نکیلی سینگیں نظر نہیں آرہی ہیں۔ جناب عالی! یہ تو جوتا پہننے والا ہی جانتا ہے کہ جوتے کی میخ کہاں گڑ رہی ہے۔ اب تو بہت تھل تھل اور موٹی ہوگئی ہے۔ تہہ بہ تہہ چربی کی تہہ۔ اسے اپنے گھر پریوار کے سوا باہر کا کچھ پتا ہی نہیں۔ عورت ــــ ایک خالص گھریلو عورت ہونا بھی کتنے سُکھ کی بات ہے۔ بیوی کا روزمرّہ کا پروگرام بالکل بندھا ٹکا ہوتا ہے۔ صبح اُٹھنا، اُلٹا سیدھا کھانا تیار کردینا اور اِس کے اُس کے بہانے ساس کو دو چار گالیاں دینا۔ بچوّں کو ڈانٹنا پھٹکارنا اور رات کو پسینے سے چپ چپاتا جسم میرے حوالے کر دینا اور پھر کروٹ بدل کر بے خبری کی نیند سو جانا۔ چلیے محفوظ، سپاٹ اور سیدھی زندگی کا ایک اور دن ختم ہوا۔

میں شروع میں اس کی بدمزاجیوں اور زنانہ جہالت کے کارن کچھ پریشان ضرور رہا مگر بعد میں عادی ہوگیا۔ اب تو مجھے اُس پر قابو پانے میں وہی لطف آتا ہے جو ایک شہ سوار کو کسی سرکش گھوڑی پر سواری کرنے میں۔ ہر عورت کی طرح زیورات اور کپڑے اس کی بھی کم زوری ہیں۔ جس کا بھگتان مجھے کرنا پڑتا ہے۔ اس کے گلے میں یہ جو چالیس گرام کا منگل سوتر نظر آرہا

ہے نا! اس کے لیے مجھے بڑی ذلالتوں سے گزرنا پڑا ہے۔ صاحب کے آگے آگے دُم ہلا ہلا کر نسبتاً "اوپری آمدنی" والی کرسی ہتیانی پڑی، اس کے لیے گپتا سے ہمیشہ کے لیے دشمنی مول لی۔ پھر روپیا روپیا، دو دو روپے کی حقیر رقموں کے لیے اس کے اُس کے گلے پر چھری پھیرتا رہا۔ یہ مت سمجھیے کہ منگل سوتر بن جانے کے بعد بیوی کی حرص کم ہو گئی ہوگی۔ حرص تو عمر کے ساتھ بڑھتی رہتی ہے۔ ہاں ـــ یہ میرے حق میں بڑی وفادار ہے۔ مگر کوئی بھی سوچ سکتا ہے کہ جو عورت جسم سے تھل تھلا گئی ہو۔ دوسرے مردوں کو مسحور کرنے کا ہنر کھو چکی ہو۔ وہ اپنے شوہر کے حق میں وفادار نہ رہے تو کیا کرے۔

میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ محبت یا وفاداری انسان کی آخری مجبوری کا نام ہے۔

بیوی کو دنیا میں صرف دو چیزوں سے بے حد پیار ہے۔ زیورات سے اور ببلو سے۔

ببلو ہمارا سات سالہ بیٹا ہے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ بڑا خوب صورت ہے۔ نہیں مجھ سے اس کی کوئی مشابہت نہیں۔ اس کا رنگ گورا اور آنکھیں نیلی ہیں۔ میں اتنا خوب صورت کہاں ہوں۔ میری بیوی کا خیال ہے کہ یہ بڑا ہو کر رچرڈ برٹن کی طرح لگے گا۔ نہیں نہیں میری بیوی کا رچرڈ برٹن سے کیا تعلق؟ کہاں وہ؟ کہاں یہ۔ مگر ہاں میں نے اسے 'بیکٹ' دکھائی تھی۔ تب ببلو پیٹ میں تھا۔ بیوی کو رچرڈ برٹن بہت اچھا لگا تھا۔ مجھے یاد بھی ہے، اُس رات وہ بڑے جوش و خروش سے مجھے لپٹاتی اور میرا منہ چومتی چاٹتی رہی تھی۔

ببلو سات برس کا ہو چکا ہے۔ مگر بیوی اب بھی اُسے گود میں بٹھا کر کھلاتی اور سینے سے لگا کر سلاتی ہے۔ بہت پیار کرتی ہے وہ ببلو کو بعض اوقات

وہ بلو کا منہ اتنی بار چومتی ہے کہ میرے اندر ہلکا ہلکا جذبۂ رقابت جاگنے لگتا ہے۔ میں نے 'بیکٹ' کے بعد سے بیوی کو رچرڈ برٹن کی کوئی فلم نہیں دکھائی۔ وہ اکثر کہتی ہے میرا بلو بڑا ہو کر ایکٹر بنے گا۔ میں کچھ نہیں کہتا۔ میری ماں بھی تو بچپن میں میرے ڈاکٹر بننے کے خواب دیکھا کرتی تھی۔ سوائے خواب دیکھنے کے آدمی کے اختیار میں ہونا بھی کیا ہے؟

سنسار کی دوسری بیویوں کی طرح میری بیوی کو بھی میرے خاندان والوں سے بے حد نفرت ہے۔ بالخصوص میرے چچا اور اُن کے گھر والوں سے۔ والد کی موت کے بعد چچا اور اُن کے تینوں بیٹے برسوں اس ٹوٹے پھوٹے مکان کے لیے مجھ سے مقدمہ لڑتے رہے۔ ایک دن انھوں نے غنڈوں سے مجھے پٹوا بھی دیا تھا۔ نہیں رشتے کہاں ختم ہوتے ہیں۔ رشتے تو زندگی کا بوجھ ہیں جسے انسان تاعمر ڈھوتا رہتا ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ آپ کسی موڑ پہ تھک کر ستانے کی خاطر تھوڑی دیر کے لیے اُس بوجھ کو اُتار دیں مگر پھر اُسے اُٹھائے ہوئے ہی آگے بڑھنا ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ آپ اپنی قبر کے دہانے تک پہنچ جاتے ہیں۔ بیوی میرے دوستوں سے از حد نفرت کرتی ہے مگر مجھے یہ سارے دوست بہت اچھے لگتے ہیں۔ انسان بغیر بیوی کے، بغیر خاندان کے زندہ رہ سکتا ہے مگر آپ بغیر دوستوں کے زندگی گزارنے کا تصور کر سکتے ہیں؟ شاید نہیں۔

یہ سارے دوست جو اس تصویر میں میرے گرد کھڑے ہیں۔ ان سب سے میری بڑی گہری دوستی ہے۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ ان میں سے بعض تو کسی نہ کسی غرض کے لیے مجھ سے جڑے ہیں۔ بعض وہ ہیں جن سے میں اپنی مطلب براری کے لیے بندھا ہوں۔ غور سے دیکھیے تو ہر دوستی کی بنیاد کسی نہ کسی غرض پر قائم نظر آئے گی۔ شاید دوستی بھی انسان کی بے شمار ضرورتوں میں سے ایک ہے۔ ماں،

بیوی، باپ، بھائی، عزیز، رشتے دار کتنی پرچھائیاں میرے گرد منڈلا رہی ہیں۔
میں ایک آئینہ بن گیا ہوں۔ جس میں دوسروں کے عکس گڈ مڈ ہو گئے ہیں ــ
پرچھائیوں کے اس ہجوم میں اپنی 'ذات' کی تلاش کی انتھک کوشش نے مجھے
چور چور کر دیا ہے ــــ میں ایک سعادت مند بیٹا ہوں، ایک باوفا شوہر
ہوں، شفیق باپ ہوں، بھائی ہوں، دوست ہوں، یعنی میں جو کچھ ہوں،
دوسروں کے طفیل ہوں۔ میں 'خود' کہیں کچھ نہیں ہوں۔
کبھی کبھی مجھے لگتا ہے میری ہستی ایک ایسی کتاب ہے جس کا میں صرف
عنوان ہوں۔ ورق ورق کھنگال ڈالتا ہوں۔ اندر عنوان سے متعلق ایک
حرف نہیں ملتا۔

سنہ ۱۹۷۵ء

●

واسُو

اس کے کپڑے میلے چیکٹ ہو رہے تھے، جوتوں پر دھول کی موٹی سی تہ جمی ہوئی تھی اور پسینے سے سارا بدن چپ چپا رہا تھا۔ چہرے سے اس قدر تھکن مترشح تھی کہ صاف لگتا تھا ایک طویل مسافت طے کرکے آرہا ہے۔ کاندھے سے ایک میلا سا جھولا لٹک رہا تھا اور وہ اس طرح گھسٹ گھسٹ کر چل رہا تھا جیسے دو چار قدم چلنے کے بعد ہی لڑکھڑا کر گر پڑے گا۔ وہ جوں توں کر کے اپنے مکان کے سامنے پہنچ گیا۔ مکان کا دروازہ کھلا تھا، وہ لڑکھڑاتا ہوا اندر داخل ہوگیا۔ بیٹھک کے کمرے میں اس کی ماں بیٹھی رامائن کا پاٹھ کر رہی تھی۔ اُس کی آہٹ پاتے ہی اس نے گردن اٹھائی اور چونک کر ایک دم سے رامائن پڑھنا بند کر دیا۔ وہ تھکے تھکے قدموں سے آگے بڑھا اور سامنے بچھی آرام کرسی میں ڈھیر ہوگیا۔ جھولے کو کاندھے سے اُتار کر فرش پر ڈالتے ہوئے آنکھیں بند کرلیں۔

"کون ہے؟ ــــ کون ہو تم؟"

اس کی ماں کی گھبرائی ہوئی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ وہ رامائن بند کر کے کھڑی ہو گئی تھی۔

"میں ہوں ماں!" ــــ اُس نے تھکے تھکے لہجے میں آنکھیں بند کیے ہوئے جواب دیا۔

"میں کون؟" ماں کے لہجے میں اضطراب برقرار تھا۔ "اور اس طرح تم بغیر اجازت اندر کیسے آگئے؟"

ماں کے آخری جملے پر وہ چونک پڑا۔ آرام کرسی پر اٹھ کر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"ارے ماں! میں ہوں ــــ واسو ــــ کب سے کہہ رہا ہوں چشمے کا نمبر بدل لو، دیکھو اب دن کے اُجالے میں بھی تمھیں دکھائی نہیں دے رہا ہے۔"

"ارے چل! تو کہاں سے آیا میرا واسو، اری بہو! دیکھو تو یہ کون مشٹنڈا گھر میں گھس آیا ہے۔"

اتنے میں اندر کے کمرے سے اس کی بیوی برآمد ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں جھاڑو تھی۔ شاید وہ ماں کی آواز سن کر جھاڑو دیتے دیتے باہر چلی آئی تھی۔ اس پر نظر پڑتے ہی ٹھٹک کر دروازے ہی میں کھڑی ہو گئی۔ پھر ایک ہاتھ سے اپنے بائیں گال پر جھول آئی بالوں کی لٹ کو اُنگلی سے سرکاتی سینے پر پلّو کو درست کرتی بولی۔

"کون ہیں آپ؟"

"ارے کیا ہو گیا ہے تم لوگوں کو؟ کیا سفر نے میرا حلیہ اتنا بدل دیا ہے کہ تم لوگ مجھے پہچان ہی نہیں پا رہے ہو؟"

"اری بہو! اس موئے کی ہمت تو دیکھ، دن دہاڑے اپنے آپ کو واسو کہہ رہا ہے ــــ"

"کیا؟" اس کی بیوی بُری طرح چونکی ۔ ایک بار اسے گھور کر دیکھا ۔ پھر تیوریوں پر بل ڈال کر بولی ۔ "مسٹر ۔ کون ہیں آپ ؟ یہ شریفوں کا مکان ہے ۔ یہاں دھوکا دھڑی نہیں چلے گی ۔"

"اری بہو! ذرا پڑوس سے وکرم یا الجے کو تو آواز دے ۔ ابھی اس لباڑی کا لباڑپن معلوم ہوا جاتا ہے ۔"

"ارے کہیں تم لوگوں کے دماغ تو خراب نہیں ہو گئے ۔ کمّد! ماں کی آنکھ میں تو ویسے ہی موتیا ہے اُسے ٹھیک سے دکھائی نہیں دیتا ۔ تمھیں کیا ہو گیا ہے ؟ بھئی میں بہت تھک گیا ہوں ۔ ذرا پانی گرم کر دو ۔ نہا کر سوؤں گا ۔"

"اے ہے ، پانی گرم کر دو ۔ کون تیرے باوا کا مکان ہے رے جوتی خوار ، دیکھو تو پرائی عورت کا کیسی بے شرمی سے نام لیتا ہے ۔ بہو! میں کہتی ہوں جلدی سے کسی کو آواز دے کر بُلا ۔ کہیں یہ بدمعاش کمرے سے کچھ اُچک کر بھاگ نہ نکلے ۔"

اتنے میں اس کا پانچ سالہ بیٹا گڈّو اسکول سے آ گیا ۔ گڈّو پر نظر پڑتے ہی اس کی آنکھوں میں ایک چمک سی لہرائی ۔

"گڈّو! ادھر آؤ بیٹے! ہمارے پاس ۔ دیکھو تمھاری دادی اور ممّی پاگل ہو گئی ہیں ۔ چلو انھیں ہسپتال میں بھرتی کروا دیں ۔"

گڈّو نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا ۔ جلدی سے ماں کی کمر سے لگ کر کھڑا ہو گیا اور سہمی سہمی نظروں سے اسے دیکھتا ہوا بولا ۔

"ممّی یہ کون ہیں ؟"

اب تو اس کے پیروں تلے کی زمین کھسک گئی ۔ تو کیا گڈّو بھی اسے پہچان نہیں پا رہا ہے ۔ ایسا کیوں کر ہو سکتا ہے ۔ کیا وہ سچ مچ اتنا بدل گیا ہے ۔ مگر اسے یہاں سے گئے بہت لمبا عرصہ بھی تو نہیں ہوا ۔

_____ پھر یہ لوگ اُسے کیوں نہیں پہچان پا رہے ہیں۔ اسے تو سب کچھ یاد ہے۔ ایک ایک چہرہ، ایک ایک بات، ایک ایک واقعہ، کہیں ان چند دنوں میں گھر والے تو نہیں بدل گئے۔ اس نے ماں، بیوی اور بیٹے کے چہروں کو دیکھا۔ چہرے تو وہی تھے جو وہ پیچھے چھوڑ گیا تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ اب اندر ہی اندر اُسے بھی ایک عجیب سا خوف محسوس ہونے لگا تھا۔

وہ کرسی سے اُٹھ گیا اور گڈّو کی طرف بڑھتا ہوا پیار سے بولا۔

"گڈّو بیٹے! اِدھر آؤ دیکھو ہم تمھارے لیے ٹافیاں لائے ہیں۔"

وہ جوں ہی آگے بڑھا اس کی بیوی ایک زور کی چیخ مار کر گڈّو کو گھسیٹتی ہوئی اندر کی طرف بھاگ کھڑی ہوئی۔ اِدھر ماں بھی زور زور سے چلّانے لگی۔ اب وہ بُری طرح خوف زدہ ہو گیا۔ مارے گھبراہٹ کے کبھی دروازے کی طرف دیکھتا کبھی ماں کی طرف دیکھتا جو اپنی پیشانی پر دوہتّڑ مارتی ہوئی متواتر چلّا رہی تھی۔ آخر وہی ہوا جس کا خدشہ تھا۔ باہر سے کسی کی آواز آئی۔

"کیا ہوا ماوسی؟ کیا بات ہے؟ اور ساتھ ہی پڑوس کا اشوک اندر گھس آیا۔ اس کے ہاتھ میں ہاکی اسٹک تھی، شاید وہ ہاکی کھیلنے جا رہا تھا۔ ماں نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"ارے دیکھ بیٹا، یہ کون لفنگا گھر میں گھُس آیا ہے اور اپنے آپ کو واسو بتاتا ہے۔" اشوک اس کے پڑوسی دوست اجے کا چھوٹا بھائی تھا۔ اس نے تیوریاں چڑھائیں اور ہاکی اسٹک پر اپنی گرفت مضبوط کرتا ہوا بولا _____

"کون ہو تم؟" اب اس کی بوکھلاہٹ شباب پر تھی اس نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

"ارے اشوک! میں۔ میں _____"

اتنے میں پڑوس کی دو تین عورتیں بھی کیا ہوا؟ کیا ہوا؟ کرتی ہوئی اندر گھس

آئیں۔ مارے گھبراہٹ کے اس کے پسینے چھوٹ گئے۔ وہ حیران و پریشان بیچ کمرے میں کھڑا ایک ایک کا منہ تک رہا تھا۔ سب لوگ اسے گھیر کر کھڑے ہو گئے۔ تبھی باہر سے اس کے پتا جی اور چھوٹا بھائی رمیش بھی آ گیا۔ انھیں بھی صورتِ حال سے آگاہ کر دیا گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سب نے مل کر اسے پکڑ لیا اور کرسی پر گرا کر رسّی سے جکڑ دیا۔ وہ چیخ چیخ کر احتجاج کرنے لگا۔ مگر کسی نے اس کی ایک نہیں سُنی۔

"اب بول بدمعاش! تو کون ہے؟" اس کے پتا جی نے اس کے بال پکڑ کر جھنجوڑتے ہوئے پوچھا۔

"پتا جی! یہ آپ لوگوں کو کیا ہو گیا ہے۔ آپ لوگ یقین کیوں نہیں کرتے کہ میں واسو ہوں۔"

"شٹ اپ حرام زادے! تجھے ابھی پتا چل جائے گا کہ تو کون ہے۔ دن دہاڑے ہماری آنکھوں میں دھول جھونکتا ہے۔"

"مگر پتا جی!" اس کے چھوٹے بھائی رمیش نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "یہ شخص تو ہم سب کے ناموں سے واقف ہے۔ سب کے رشتے بھی صحیح بتا رہا ہے۔"

"ارے کوئی بہت بڑا ٹھگ معلوم ہوتا ہے۔ بہت دنوں سے ہمارے پیچھے رہا ہوگا۔"

"آخر آپ لوگ مان کیوں نہیں لیتے کہ میں واسو ہوں۔"

"کیسے مان لیں جب کہ تم واسو نہیں ہو۔"

"اب میں آپ کو کیسے سمجھاؤں کہ میں واسو ہوں۔"

"بہو ذرا واسو کا کوئی فوٹو لانا۔ ابھی سارا بھید کھل جاتا ہے۔" اس کے پتا نے بہو سے مخاطب ہو کر کہا۔

اس کی بیوی جلدی سے اندر کے کمرے میں چلی گئی اور تھوڑی دیر بعد بوکھلائی ہوئی سی لوٹ آئی۔

"باپو! ان کی ساری تصویریں غائب ہیں! —"
"کیا — ؟ بیک وقت کئی لوگوں کی زبان سے نکلا۔
"ہاں — یہ دیکھیے یہ البم، اس میں ان کی ایک بھی تصویر نہیں ہے۔ دیوار پر جو فریم لگی تھی وہ بھی غائب ہے —"
سب نے جلدی جلدی البم کو الٹ پلٹ کر دیکھا — سچ مچ البم میں اس کی ایک بھی تصویر نہیں تھی۔ پھر سارا گھر چھان مارا گیا۔ کہیں سے بھی اس کا کوئی فوٹو برآمد نہیں ہوا۔ تھک ہار کر سب لوگ پھر اس کے گرد جمع ہو گئے۔
"ان سے دستخط کرنے کے لیے کہیے ابھی سب معلوم ہو جائے گا"۔ کسی نے تجویز رکھی۔ کاغذ قلم لایا گیا اور اس سے دستخط کرنے کو کہا گیا۔ اس نے فوراً کاغذ پر دستخط کر دیے۔ دستخط واسو ہی کے تھے۔ سب کے چہروں پر تحیّر اور کشمکش کے آثار دکھائی دینے لگے۔ ماں، باپ اور بیوی کے چہرے تو فق ہو گئے۔ اس نے لوگوں کی اس گومگو کیفیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا۔
"سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ لوگوں کو کیا ہو گیا ہے۔ ارے میں واسو ہوں اور آپ لوگ یہ ثابت کرنے پر تلے ہیں کہ میں واسو نہیں ہوں۔ میں ایک ہزار ثبوت دے سکتا ہوں کہ میں واسو ہوں۔ مجھے پریشان مت کیجیے ورنہ میرا دماغ الٹ جائے گا۔ اُف! انتہا ہو گئی، ماں اپنے بیٹے کو نہیں پہچانتی، بیوی اپنے شوہر کی انکاری ہے۔ بھائی بھائی کو نہیں جانتا حد ہو گئی" — اس کا گلا رندھ گیا۔
کوئی کچھ نہیں بولا۔ پھر اس کے پتا جی نے خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا۔
"اچھا بتاؤ میں کون ہوں؟"
"آپ کون ہیں؟ ارے آپ میرے پتا جی ہیں — آپ کا نام گوپی ناتھ ہے آپ کے پتا جی کا نام امرناتھ تھا۔ یہ میری ماتا ہیں۔ یہ رمیش ہے۔ میرا چھوٹا بھائی

بی۔کام۔ کے آخری سال میں ہے۔ یہ گیٹو ہے، میرا بیٹا۔ سینٹ میری میں فرسٹ اسٹینڈرڈ میں پڑھ رہا ہے۔ یہ میری پتنی ہے کُمُد۔۔۔۔۔"

"ہٹ ــــ میں تیری پتنی کیوں ہونے لگی نگوڑے۔" اس کی پتنی نے غصّے اور شرم سے سُرخ ہوتے ہوئے کہا۔ اس پر کچھ لوگ دبی دبی ہنسی ہنس دیے۔

"تم میری پتنی نہیں ہو؟" اسے بھی غصّہ آگیا۔

"کیا یہ جھوٹ ہے کہ ہماری شادی چودہ نومبر انیس سو ستّر کو ہوئی تھی۔ یہ بھی جھوٹ ہے کہ پانچ جنوری بہتّر کو گٹّو پیدا ہوا تھا اور۔۔۔۔ اور ــــ یہ بھی جھوٹ ہے کہ تمھاری دونوں چھاتیوں کے بیچ میں ایک بڑا سا کالا تل ہے۔"

"چوپ ــ بدتمیز۔" اس کے پتاجی گرجے اور ایک زور کا چانٹا اس کے منہ پر رسید کردیا۔ اس کی بیوی "اوئی ماں" کہتی ہوئی دروازے کی اوٹ میں ہوگئی۔ اور ایک بار پھر سب اس پر ٹوٹ پڑے اور اُسے مارتے گھسیٹتے مکان کے اندر ایک اندھیری کوٹھری میں لے گئے۔ ہاتھ پانو باندھ کر ایک کونے میں پٹکا اور باہر سے کنڈی چڑھادی۔ دوبارہ سب بیٹھک کے کمرے میں جمع ہوگئے اور سر جوڑ کر اُس افتاد پر غور کرنے لگے۔ گوپی ناتھ بابو تو بہت پریشان تھے۔ اُس کا جھولا وہیں فرش پر پڑا تھا۔ اُسے اُلٹا گیا، اندر سے کچھ کاغذات، ایک کتاب، مسواک، تولیا ایک جوڑی کپڑے اور ٹافیوں کا ایک ڈبّا برآمد ہوا۔ کاغذات پر عجیب عجیب نقشے اور زائچے بنے ہوئے تھے۔ کہیں کہیں مختلف اعداد کو لکھ کر بار بار کاٹا گیا تھا۔ سارا سامان وہی تھا جو واسو سفر پر جاتے وقت لے گیا تھا۔ صرف ٹافیوں کا ڈبا زائد تھا۔

"سامان تو سب وہی ہے جو وہ ساتھ لے گئے تھے۔" اس کی بیوی نے چیزوں کو اُلٹتے پلٹتے کہا۔

"ہاں، سامان تو وہی ہے۔" ماں نے تصدیق کی۔

"پھر بھیّا کہاں چلے گئے؟" رمیش نے پُرتشویش لہجے میں کہا۔
"کچھ سمجھ میں نہیں آتا کیا چکّر ہے۔" اس کا باپ دونوں ہاتھوں سے سر تھامے بڑبڑانے لگا۔
"انکل آپ پولیس میں اطلاع کر دیجیے" — واسو کے دوست اجے نے مشورہ دیا۔
"کیا اطلاع کی جائے — ہمارے پاس بھی کیا ثبوت ہے کہ وہ واسو نہیں ہے۔"
"ارے ہم سب گواہ ہیں کہ وہ واسو نہیں ہے۔"
"مگر وہ جس تفصیل اور باریکی سے ایک ایک بات بتا رہا ہے وہ تو صرف واسو ہی بتا سکتا تھا۔"
"سو تو ہے پھر بھی —"
"بات بڑھانے سے سُبکی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ بس کسی صورت اس سے یہ قبول کروالینا ہے کہ وہ واسو نہیں ہے یا پھر واسو کے لوٹنے تک ہمیں انتظار کرنا ہوگا۔"
"واسو نے کب تک لوٹنے کو کہا تھا؟"
"ٹھیک چالیس روز بعد — آج اماوس ہے نا۔ بس آج رات تک لوٹ آنا چاہیے کیوں بہو، تم سے بھی کچھ کہا تھا۔؟"
"نہیں — بس اماوس تک لوٹنے کی بات کہی تھی۔"
"مگر انکل سفر کی نوعیت کیا تھی؟"
"نوعیت!" اس کے پتاجی سوچ میں پڑ گئے — "نوعیت تو مجھے بھی نہیں معلوم بیٹا۔ بس ایک دن اچانک کہنے لگا میں شہر سے باہر جا رہا ہوں اور پورے چالیس دن بعد لوٹوں گا۔ ہم نے پوچھا کہاں جا رہے ہو؟ بولا یہاں کے ماحول نے میری رُوح کو بیمار کر دیا ہے میں اپنی آتما کی کھوج میں جا رہا ہوں۔ مجھے تلاش کرنے کی

کوشش نہ کیجیے گا میں خود لوٹ آؤں گا۔"

"اوہو" اجے کے ہونٹ تشویش کے سے انداز میں سکڑ گئے۔ "انکل، آپ کو یہ بات مجھے بہت پہلے بتانا چاہیے تھی۔"

"ہاں بیٹا، اب میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔ شاید اُس کے یوں اچانک چلے جانے سے میری مت ماری گئی تھی۔"

"خیر ـــ تو پھر آج کا ایک دن اور دیکھ لیجیے۔"

"یہی کرنا ہوگا۔"

اس کے بعد پڑوس کے لوگ ایک ایک دو دو کر کے اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے اور گھر کے افراد اس طرح گم سم جہاں کے تہاں بیٹھے رہ گئے جیسے ابھی ابھی کسی عزیز کی موت کی خبر سُنی ہو۔

شام ہوئی، شام سے رات ہوئی، پھر صُبح بھی ہو گئی۔ ایک دن، دو دن، تین دن۔ واسو نہیں لوٹا ـــ

اس عرصے میں وہ لوگ صبح شام اس کی کوٹھری میں جا کر اس سے قبولوانے کی کوشش کرتے کہ وہ واسو نہیں ہے اور ہر بار وہ ان سے گڑگڑا کر کہتا۔

"تم لوگ کیوں مجھے زندہ در گور کیے ہوئے ہو۔ اگر میں واسو نہیں ہوں تو مجھے زہر دے کر مار دو ـــ قتل کر کے یہیں کوٹھری میں دفن کر دو۔ یا پھر مجھے پولیس کے حوالے کر دو تا کہ مجھے اس عذاب سے نجات ملے۔"

مگر اس کی کوئی سننے کو تیار نہیں تھا۔ جب بھی کوٹھری کا دروازہ کھلتا اس سے پوچھا جاتا۔

"سچ سچ بتاؤ کیا تم واسو ہو؟"

"بتاؤ واسو کہاں ہے؟ کہیں تم نے اسے قتل تو نہیں کر دیا؟"

اور ہر بار وہ جواب دیتا۔ "میں واسو ہوں، میں واسو ہوں، ہزار بار واسو ہوں۔ میں خود اپنا قتل کیسے کر سکتا ہوں"

اسی طرح مزید چند روز گزر گئے۔ اس کے بعد انھوں نے اسے زدوکوب کرنا شروع کر دیا۔ بید اور چابک سے اتنا مارا کہ سارے بدن پر نیل پڑ گئے ــــ گرم گرم سلاخوں سے داغا۔ بال پکڑ کر پوری کوٹھری میں گھسیٹا، سوئیوں سے چھیدا۔ مگر وہ یہی کہتا رہا، میں واسو ہوں، میں واسو ہوں، مجھے مت مارو، میں واسو ہوں۔

پتا نہیں پھر کیا ہوا، شاید وہ لوگ اسے سزا دیتے دیتے تھک گئے یا پھر اسے سزا دینا ان کے نزدیک روز کا ایک بے کیف معمول بن کر رہ گیا۔

جو بھی ہو، صبح شام، رات دن، اسے دیکھتے دیکھتے، مارتے کاٹتے، گالیاں دیتے غالباً اب وہ سب لوگ اس کے وجود کے عادی سے ہوتے جا رہے تھے۔ اسے دیکھتے ہی اب بھی ان کی آنکھوں میں خون اتر آتا۔ مگر جوں جوں دن گزرتے جا رہے تھے، انھوں نے محسوس کیا کہ نفرت اور غصّے کی اُن دبیز تہوں کے نیچے اُنسیت اور ہمدردی کا ایک ننّھا سا چشمہ بھی کروٹیں لینے لگا ہے۔ ہر چند کہ اُس کا سُر ابھی مدھم تھا۔ تاہم دھیرے دھیرے اس کی دھمک وہ لوگ اپنے لہو میں محسوس کرنے لگے۔

آخر ایک دن سب لوگ بیٹھک کے کمرے میں جمع ہوئے۔ باپ، ماں، بیوی، بھائی، پڑوسی، دوست، احباب سبھی موجود تھے۔ بہت دیر کی تکرار و بحث کے بعد یہ طے پایا کہ اسے واسو تسلیم کر لیا جائے۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ انھوں نے سوچا ممکن ہے وہی صحیح کہہ رہا ہو۔ وہ واسو ہی ہو اور یہ لوگ کسی بھیانک غلط فہمی کی وجہ سے اُسے واسو تسلیم کرنے سے انکار کر رہے ہوں۔ سب لوگ اس کی کوٹھری کے سامنے آ کھڑے ہو گئے۔ ماں اس کے لیے ہاتھوں میں کھانے کی تھالی لیے کھڑی تھی۔ بیوی ایک دُھلا دُھلایا کپڑوں کا جوڑا لیے دروازہ کھلنے کی منتظر تھی۔ ایک طرف بھائی، دوست

اور دوسرے عزیز کھڑے تھے۔ سب کی نظریں کوٹھری کے دروازے پر جمی تھیں۔
آخر اس کے باپ نے آہستہ سے کوٹھری کا دروازہ کھولا۔ کوٹھری میں اندھیرا تھا۔ کسی نے ٹارچ جلائی۔ ٹارچ کی محدود روشنی میں لوگوں نے دیکھا کہ وہ ایک کونے میں گھٹنوں میں سر ڈالے بیٹھا ہے۔ کمرے میں ایسا تعفّن پھیلا تھا کہ دو منٹ رکنا محال تھا۔ اس پر ٹارچ کی روشنی پڑتے ہی اس نے وحشی جانور کی طرح چونک کر گردن اٹھائی۔
اُف! آنکھیں تھیں کہ لہو کے جمے ہوئے ڈلے۔ باپ نے دھیرے سے پُکارا
"بیٹا واسو! چلو، باہر چلو، ہم تمھیں لینے آئے ہیں۔"
اس آواز پر وہ یک بارگی بُری طرح چونکا — چونک کر گردن اٹھائی، پھر چندھیائی آنکھوں سے ایک ایک کو تکتا ہوا اجنبی لہجے میں بولا۔
"واسو؟ میں واسو نہیں ہوں۔ آپ لوگ کون ہیں؟"
چھنن — نن — نن — ن — ن —،
ماں کے ہاتھ سے کھانے کی تھالی چھوٹ کر فرش پر گر گئی۔ اور وہ سب ایک دوسرے کو حیرت اور استعجاب سے دیکھتے رہ گئے۔

●

سنہ ۱۹۷۷ء

پیٹا

میں کب چاہتا تھا کہ وہ میرے ساتھ آئے ۔ مگر وہ تو گھر ہی سے میرے ساتھ چلا تھا۔ میں نے دروازے ہی پر اُسے گھُڑکا پر وہ اتنی آسانی سے پنڈ چھوڑنے والا نہیں تھا۔ میں نے فٹ پاتھ پر چلتے چلتے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ وہ سر جھکائے، چہرے پر دُکھ اور افلاس کے بھاو لیے ڈھیلے ڈھالے قدم اُٹھاتا چلا آرہا تھا۔ میں نے اپنی رفتار تیز کر دی۔ میں اُسے بھیڑ میں جُل دے کر نکل جانا چاہتا تھا۔ بائیں طرف کراسنگ تھی۔ اچانک سگنل کی گرین آنکھ کھُلی۔ "جائیے" چمک رہا تھا۔ اِدھر اُدھر سے لوگ جھپٹے۔ انداز ایسا تھا جیسے ابھی یہیں سڑک پر ایک دوسرے کی گردنیں مروڑ کر ڈال دیں گے۔ مگر سب کے سب ایک دوسرے سے کترا کر نکل گئے۔ صرف چلتے ہوئے ایک نوجوان لڑکے نے آتی ہوئی ایک پارسی لڑکی کے اُبھرے سینے کو دھکا دیا اور تیزی سے آگے نکل گیا۔ لڑکی بھی رکی نہیں صرف "ایڈیٹ"

کہتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ لڑکا دوسری فٹ پاتھ پر پہنچ کر مڑا، لڑکی بھی سامنے والی فٹ پاتھ پر جاکر مڑی اور دونوں کی نظریں ٹکرائیں، لڑکا مسکرایا، لڑکی بھی مسکرائی اور دونوں مختلف سمتوں میں چل دیے۔ دوسری فٹ پاتھ پر پہنچ کر میں ایک کیبن کی اوٹ سے آگے بڑھ گیا اور بغلی گلی میں گھس گیا۔ مجھے یقین تھا کہ میں اسے چکما دینے میں کامیاب ہوگیا ہوں۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا اور سگریٹ کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ جیب خالی تھی۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا سامنے ایک سگریٹ کی دُکان تھی۔ میں نے جیب سے پیسے نکالے۔ دکان سے ایک پیکٹ چارمینار اور ماچس خریدی۔ پیکٹ سے ایک سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں داب لی اور جوں ہی اسے سلگانے کے لیے ماچس پر تیلی رگڑی، تبھی ایک لجاجت آمیز آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

"مجھے بھی ایک سگریٹ دیجیے نا"

میں نے چونک کر گردن اُٹھائی۔ وہ میرے بالکل قریب ہی کھڑا تھا۔ چہرہ حد درجہ خوشامدانہ اور آنکھوں میں التجا۔ مجھے بے حد غصّہ آیا۔ میں نے ایک حقارت آمیز نظر اس پر ڈالی اور پیکٹ سے ایک سگریٹ نکال کر اسے دے دی۔ اُس نے بغیر شکریہ ادا کیے سگریٹ لے لی جیسے وہ اس کا حق ہی رہا ہو۔ میں نے اپنی سگریٹ جلاکر سلگتی تیلی سے اس کی سگریٹ بھی جلادی۔ اس نے ایک گہرا کش لیا۔ اس کے منہ کا خارج کیا ہوا دھواں میرے چہرے پر پھیل گیا۔ میں نے نفرت سے منہ پھیرلیا۔ اور تیزی سے ایک طرف بڑھ گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ اب بھی میرے ساتھ آرہا ہے۔ میں گلی کے نکڑ پر پہنچ کر رک گیا۔ وہ بھی میرے پیچھے ہی آکر رکا۔ میں نے غصّے سے مڑتے ہوئے تیز لہجے میں پوچھا۔

"منع کرنے کے باوجود تم کیوں میرے ساتھ چلے آرہے ہو؟"

اُس کے خشک ہونٹوں پر ایک چاپلوسانہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس کی ملتجی نظریں میرے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں۔ مجھے لگا میرے گالوں پر بے شمار لجلجے کیچوے رینگ رہے ہیں۔ میں نے جلدی سے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ وہ مسکرایا میں جھنجلا گیا۔

"آخر تم جواب کیوں نہیں دیتے؟ تم میرے ساتھ کیوں آرہے ہو؟"

"میں تمھارا ساتھ چھوڑ کر بھلا کہاں جاسکتا ہوں۔"

"جہنم میں جاؤ، مگر میرا پیچھا چھوڑو۔"

"آخر ساتھ چلنے میں کیا بُرائی ہے؟"

"مجھے تم سے نفرت ہے۔ دلی نفرت، مجھے تمھاری شکل زہر لگتی ہے۔ اب سیدھے سیدھے میرا پنڈ چھوڑو۔ ورنہ یہیں سڑک پر ......" وہ اب بھی مسکرا رہا تھا۔ میرے غصّے کا اس پر ذرا بھی اثر نہیں ہوا۔

"تم جانتے ہو کہ تمھاری دھمکیوں کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ تمھاری نفرت بھی میرے لیے بے معنی ہے۔ میں تمھارا پیچھا نہیں چھوڑوں گا۔ البتہ تمھارے کسی معاملے میں دخل نہیں دوں گا۔ وعدہ کرتا ہوں۔"

مجھے غصّہ تو بہت آیا۔ مگر میں غصّے کو پی گیا کیوں کہ اس چلتی پھرتی گلی میں اسے پھٹکارنا یا زدوکوب کرنا مناسب نہیں تھا۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ وہ ہرگز میرا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔ اس لیے میں نے سوچا اگر وہ چپ رہنے کا وعدہ کرتا ہے تو ساتھ لے چلنے میں کیا حرج ہے۔ میں کچھ دیر چپ رہا۔ پھر بولا

"دیکھو اگر تم نے وہاں اپنی زبان کھولی تو مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا۔ تمھیں وہاں بالکل خاموش رہنا ہے۔"

"کیا آج تک میں نے کبھی تمھارے کسی معاملے میں دخل دیا ہے۔ تم تو

ہمیشہ مجھے اپنے پیر کی جوتی کی طرح روندتے رہے ہو۔"
مجھے اس کے احساسِ مظلومیت سے بڑی خوشی ہوئی۔ میں بولا۔
"تم ہو ہی اِس قابل، تم ہمیشہ میری ٹھوکروں ہی میں رہو گے۔ مجھے تمھارے بھکاریوں کے سے انداز اور خوشامدانہ لب ولہجے سے سخت نفرت ہے۔ تم کِسی ریل یا موٹر کے نیچے پڑ کے مر کیوں نہیں جاتے؟"
"میں کبھی نہیں مر سکتا۔ تم نے کتنی دفعہ مجھے قتل کرنے کی کوشش کی مگر کیا تم کامیاب ہو سکے؟ میں جانتا ہوں کہ تم مجھ سے طاقت ور ہو۔ میں تمھارے سامنے بہت ہی حقیر اور کم زور ہوں۔ اس کے باوجود تم مجھے نہیں مار سکتے۔ تم نے مجھے ہمیشہ دبایا، کچلا۔ میں وقتی طور پر مر جاتا ہوں۔ مگر پھر نئی طاقت لے کر زندہ ہو جاتا ہوں۔ میں اب پہلے کی طرح کم زور بھی نہیں رہا۔ مگر میں تم پر ہاتھ نہیں اٹھاؤں گا۔ یقین رکھو۔"
اس کی باتوں سے میرا جسم غصّے کے مارے کانپنے لگا۔ جی میں آیا کہ اس سور کا وہیں گلی میں لوگوں کی پروا کیے بغیر گلا گھونٹ دوں۔ نیچے گرا کر اتنی ٹھوکریں لگاؤں کہ اس کے چیتھڑے بکھر جائیں۔ مگر میں صرف پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔ کیوں کہ واقعی وہ اب پہلے جیسا کم زور نہیں رہ گیا تھا اور نہ پہلے کی طرح میں اُسے آسانی سے زیر کر سکتا تھا۔ میں نے اس کا گلا گھونٹنے کی بجائے اپنے غصّے کا گلا گھونٹ دیا کچھ دیر تک اُس کے چہرے پر نظریں جمائے رہا۔ پھر اپنے لہجے کو ذرا سخت بناتے ہوئے ایک لمبی سانس کھینچ کر بولا۔
"تو تم وہاں ایک لفظ نہ کہو گے۔"
"نہیں" اُس کی مسکراہٹ سے میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔
"تو پھر چلو" میں نے بادلِ ناخواستہ کہا۔ "مگر یاد رکھو اگر تم نے ذرا بھی

چوں چرا کی تو آج زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

اس نے اثبات میں گردن ہلادی۔ میں آگے بڑھا۔ وہ بھی میرے ساتھ چل رہا تھا۔ میں نے اُس کی طرف سے اپنا دھیان ہٹا لیا۔ مگر میں نے محسوس کیا کہ وہ میری گردن کی پُشت پر نظریں جمائے مسکرا رہا ہے۔ مجھے غصّہ تو بہت آرہا تھا مگر میں رُکا نہیں۔ میرے قدم تیزی سے اُٹھ رہے تھے۔ وہ بھی سایے کی طرح میرے پیچھے چلا آرہا تھا۔ گلیاں، سڑکیں فٹ پاتھ اور کراسنگ میں چلتا رہا۔ چلتا ہی رہا۔ آخر میں اُس بلڈنگ کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ بورڈ دیکھا اور اندر داخل ہو گیا میں لفٹ کے سامنے جا کر رُک گیا۔ میرے آگے دو اور آدمی کھڑے تھے۔ وہ بھی میرے پیچھے آکر کھڑا ہو گیا۔ لفٹ نیچے آئی۔ دروازہ کھُلا۔ کچھ لوگ باہر نکلے۔ میرے آگے کے دونوں شخص اندر داخل ہو گئے۔ میں بھی گھس گیا۔ وہ بھی میرے ساتھ ہی اندر آیا۔ دروازہ بند ہوا اور لفٹ اوپر اُٹھنے لگی۔ پہلی منزل، دوسری منزل، تیسری منزل، چوتھی منزل۔ پانچویں منزل پر دروازہ کھُلتے ہی میں لفٹ کے باہر چلا آیا۔ میں نے مڑ کر نہیں دیکھا مگر اُس کے پیروں کی چاپ برابر میرے کانوں سے ٹکرا رہی تھی۔ میں ایک دروازے کے سامنے رکا۔ باہر چپراسی کھڑا تھا۔ میں نے ایک ٹائپ کیا ہوا کاغذ اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ اُس نے کاغذ پر ایک سرسری نظر ڈالی اور بغیر کچھ کہے اندر چلا گیا۔ میں مڑا۔ وہ مجھ سے چپک کر کھڑا تھا۔ میں نے آہستہ سے کہا۔

"دیکھو اگر تم یہیں باہر رُک جاؤ تو کیا حرج ہے۔ میں دس منٹ میں واپس آجاؤں گا۔"

"نہیں، میں بھی تمھارے ساتھ ہی اندر آؤں گا۔"

مجھے اُس کے لہجے کی سختی پر بڑی حیرت ہوئی۔ یہ پہلا اتفاق تھا کہ اُس نے اتنے سخت لہجے میں مجھ سے گفتگو کی تھی۔ میں نے مٹھیاں بھینچ لیں اور قریب تھا کہ

میرا گھونسا اُس کے جبڑے پر پڑتا۔ اتنے میں چپراسی نے آکر کہا۔ "چلیے"۔ میری بھچی ہوئی مٹھیاں کھُل گئیں اور میں اندر چلا گیا۔ چپراسی ایک دروازے کے پاس آکر رُک گیا چق پر 'مینیجر' لکھا تھا۔ میں چپراسی کے اشارے پر چق ہٹا کر اندر چلا گیا۔ وہ بھی ساتھ ہی اندر آیا۔ سامنے ایک بڑی میز تھی۔ میز کے پیچھے گنجے سر اور چمکتی آنکھوں والا ایک تنومند شخص بیٹھا تھا۔ غالباً وہ مینیجر تھا۔ اُس کے سامنے میز پر کچھ کاغذات بکھرے تھے۔ شاید اُن میں میرے سرٹی فکٹ بھی تھے۔ اس نے میز کے اس طرف رکھی ہوئی کرسی کی طرف اشارہ کیا اور میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں نے کنکھیوں سے دیکھا وہ میرے دائیں جانب میز کے کونے کے پاس ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ اُس کے چہرے پر وہی خوشامدانہ بھاو تھے اور آنکھوں میں لجاجت۔ غصّے کے مارے میرا وجود سُلگنے لگا۔ مگر میں چُپ رہا۔ اُس تنومند شخص نے اپنا گنجا سر اُٹھایا اور مجھ سے پوچھا۔

"نام؟" میں نے اپنا نام بتایا

"تاریخ پیدائش؟" میں نے وہ بھی دُہرا دی۔

موٹا شخص میرے سرٹی فکٹس اُلٹتا پلٹتا رہا۔ "اس سے پہلے کہاں سروس کرتے تھے؟"

"کہیں بھی نہیں، بے کار تھا"۔

"تمھیں گریجویشن کیے ہوئے تو چار سال ہو گئے۔ کہیں کوشش نہیں کی؟"

اُس کے سامنے میز پر میرا بی۔ اے۔ آنرز کا سرٹیفکٹ تھا۔

"کی کیوں نہیں، پچیسیوں جگہوں پر کر چکا ہوں۔ مگر میرے پاس کسی بڑے آدمی کی سفارشی چِٹھی نہیں تھی"۔

"اوہو!" گنجے سر پر جڑی ہوئی دو چمک دار آنکھیں میرے چہرے کا جائزہ لینے لگیں۔

"کیا تمھیں یقین ہے کہ تم یہاں سروس پا جاؤ گے۔"
"مجھے پچھلی پچیسوں جگہوں پر بھی یقین تھا کہ میں سلیکٹ ہو جاؤں گا۔ کیونکہ میں فرسٹ کلاس گریجویٹ ہوں اور میرا خاص مضمون اکنامکس ہے۔"
"ٹھیک ہے یہاں تمھارا تقرر ہو جائے گا۔ مگر تمھیں ایک اقرار نامے پر دستخط کرنے ہوں گے۔"
"جی! مگر میں پہلے اُس کی شرائط جاننا چاہوں گا۔"
"صرف ایک معمولی سی شرط ہے۔"
"پھر بھی میں اقرار نامہ پڑھے بغیر دستخط نہیں کروں گا۔"
وہ چند لمحوں تک مجھے گھورتا رہا پھر بولا۔ "تمھیں ڈیوٹی پر رجوع ہونے کے بعد اپنے گلے میں ایک پٹّا باندھنا ہوگا اور یہ پٹّا ریٹائر ہوتے تک تمھارے گلے میں بندھا رہے گا۔"
اس کے ہاتھ میں ایک سنہرے رنگ کا پٹّا چمک رہا تھا۔ میں خوب جانتا تھا کہ وہ پٹّا کس قسم کا ہے۔ مجھے لگا جیسے وہ پٹّا میرے گلے کو جکڑے ہوئے ہے اور میں دُم ہلاتا اُس شخص کے پیچھے پیچھے گھوم رہا ہوں اور لوگ مجھے دیکھ دیکھ کر کہہ رہے ہیں دیکھو وہ جا رہا ہے صاحب کا ......" میں نے بڑی سختی سے جواب دیا۔
"نہیں مجھے یہ شرط منظور نہیں۔" اور میں ایک جھٹکے سے کُرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ تبھی میز کے دوسرے کونے سے اُس نے گِڑگِڑاتی آواز سے کہا۔
"مجھے منظور ہے صاب ...."
وہ دونوں ہاتھ جوڑے اپنے چہرے پر چاپلوسی اور خوشامد کے سارے انداز سمیٹے گڑگڑا رہا تھا۔ میرا سارا بدن غصّے اور نفرت سے لرزنے لگا۔ آخر وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ کتنا اچھا ہوتا اگر میں نے اِسے گھر ہی پر ختم کر دیا ہوتا یا گلی میں

گلا گھونٹ کر مار ڈالا ہوتا۔ نیچ، ذلیل، کتا، مار ڈالوں گا اُسے۔ آخر مجھے اس طرح ذلیل کرنے کا اُسے کیا حق ہے۔ کمینہ کہیں کا، بے حیا! میرے ہاتھوں کی دسوں انگلیاں اُس کی گردن کو مروڑ دینے کے لیے بے تاب ہو اُٹھیں۔ میں ایک دم آگے بڑھا کہ اس کا گلا گھونٹ دوں اور ہمیشہ کے لیے اس کا خاتمہ کر دوں۔ مگر میں حیران رہ گیا۔ جب میرے دونوں ہاتھ اُس کی گردن پر پہنچنے کے بجائے میری گردن سے لپٹ گئے۔ انگلیاں دھیرے دھیرے میرے گلے میں پیوست ہونے لگیں۔ جیسے میرے ہاتھ میرے اپنے نہ ہو کر میرے کسی ازلی دشمن کے ہاتھ ہوں۔ جو برسوں سے میرے خون کا پیاسا رہا ہو۔ میرے ہاتھوں کی گرفت میری گردن پر سخت ہو گئی۔ میرا دم گھٹنے لگا۔ سانس اُکھڑ گئی اور آنکھوں تلے اندھیرا چھانے لگا۔ اندھیرا، گہرا اندھیرا...... پھر مجھے کسی بات کا ہوش نہ رہا۔ شاید میں مر گیا تھا۔ اپنی خودداری، غرور اور وقار کو سینے سے لگائے میں نے خودکشی کر لی تھی۔ مگر ہاں وہ آج بھی زندہ ہے۔ اب وہ اُس فرم کا اسسٹنٹ منیجر ہے۔ نفیس کپڑے پہنتا ہے۔ کلب جاتا ہے۔ عمدہ شرابیں پیتا ہے اور کار میں گھومتا ہے۔ مگر ہر جگہ وہ سنہرا پٹّا اُس کے گلے میں چمکتا رہتا ہے۔

●

سنہ ۱۹۷۰ء

زنجیر ہلانے والے

رات بے حد تاریک تھی، تاریک اور طویل۔ سڑکیں ویران اور گلیاں غیر آباد تھیں۔ بستی پر اس سرے سے اُس سرے تک ایسا سناٹا چھایا تھا کہ ایک گھر میں ذرا سا کھٹکا ہو تو پاس پڑوس کے دس گھر والے سُن لیں۔ نہ جھینگروں کی جھائیں جھائیں، نہ چمگادڑوں کی پھڑپھڑاہٹ۔ حد تو یہ کہ عرصے سے کسی کُتّے کے بھونکنے کی آواز بھی نہیں آئی تھی۔ مکانوں کی کھڑکیاں اور دروازے مضبوطی سے بند تھے۔ شاید بستی کے سبھی لوگ اپنے اپنے گھروں میں دُبکے سہمے کسی اَن ہونی کا انتظار کر رہے تھے۔

چندر بھان مکان کی کھڑکی دروازے بند کیے اپنے گھر والوں کے ساتھ چپ چاپ بیٹھا تھا۔ اُس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے تھے۔ جیسے کئی راتوں کا جاگا ہو۔ اُس کی بیوی ساڑی کے پلّو سے منہ ڈھکے، دیوار سے ٹکی ٹکی اونگھ گئی تھی۔ ماں ایک طرف کو لڑھکی پڑی تھی۔ بچّی بیوی کی گود میں اور بڑا لڑکا اپنی دادی کے سینے سے لگا

لگا سو گیا تھا۔ باپ آرام کرسی پر آنکھیں بند کیے لیٹا تھا۔ مگر چندر بھان کوشش کے باوجود اپنی آنکھ نہیں جھپک پا رہا تھا۔ کمرے میں ایک ننھا سا بلب گدلی گدلی روشنی پھینک رہا تھا۔ پورے مکان پر عجیب دہشت بھری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔
چندر بھان نے کرسی پر پہلو بدلا اور اپنے بوڑھے باپ کی طرف دیکھا۔ اُسے بڑی دیر سے سگریٹ کی طلب محسوس ہو رہی تھی۔ مگر ـــــ باپ کی موجودگی مانع تھی۔ وہ دیر سے سوچ رہا تھا اُٹھ کر کچن میں چلا جائے اور وہاں ایک آدھ سگریٹ پھونک کر واپس آکر بیٹھ جائے۔ مگر اُس پر کچھ ایسی تساہلی چھائی تھی کہ جگہ سے ہلنا بھی جان پر آرہا تھا۔ ویسے وہ یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ اس تساہلی میں خوف کو کتنا دخل تھا ـــ سگریٹ کی خواہش کے ساتھ اُس کی بے چینی میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ اُس کے پھیپھڑے سگریٹ کے دھویں کے بغیر خالی غباروں کی طرح سکڑتے جارہے تھے۔ جب تک وہ دو چار کش نہیں لگائے گا، کوئی شَے اُسی طرح پھیپھڑوں سے حلق کی راہ ہونٹوں پر آ آ کر مچلتی رہے گی۔ اُس نے اُٹھ کر کچن میں جانے کا پکّا ارادہ کرلیا۔ تبھی باہر اُسے ایک عجیب سی سنسناہٹ سُنائی دی۔ پہلے تو وہ کچھ سمجھ نہیں پایا کہ وہ کیسی آواز ہے۔ تھوڑی دیر تک غور کرتا رہا۔ مگر لاحاصل ـــ بس کچھ ایسا لگ رہا تھا جیسے ہوا کسی بہت بڑے جہاز کے بادبان میں پھنس کر سسک رہی ہو۔ سنسناہٹ کسی سائرن کی طرح تیز ہوتی جارہی تھی۔ اچانک اس کے باپ نے بھی آنکھیں کھول دیں۔ اُس کی بوڑھی آنکھیں تھوڑی دیر تک مچ مچ کرتی رہیں۔ پھر پھیلتی گئیں، پھیلتی گئیں۔ وہ گھبرا کر کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوگیا۔ اُسے لگا باپ کی آنکھیں تھوڑی اور پھیلیں تو کان کی لَوؤں سے جالگیں گی۔

"کیا ہے ؟" بوڑھے کی گھبرائی ہوئی سرگوشی سُنائی دی۔

"آپ کی ـــ آ ـــ" وہ کہتے کہتے رُک گیا۔

آنکھوں کے ڈھیلے دوبارہ اپنے غاروں میں لوٹ آئے تھے۔

"میرا مطلب ہے ـــ شاید سائرن کی آواز ہے۔"

"نہیں یہ سائرن کی آواز نہیں ہوسکتی ـــ"

"پھر کیا ہے؟"

"پتا نہیں ـــ ایسی آواز میں نے پہلے کبھی نہیں سُنی۔"

پھر اُس آواز میں ایک اور آواز شامل ہوتی سی معلوم ہوئی۔

کھڈڑک، کھڈڑک، کھڈڑک، جیسے سیکڑوں ہزاروں گھُڑسوار آندھی اور طوفان کی طرح گھوڑے اُڑاتے چلے آرہے ہوں۔ دھیرے دھیرے سائرن جیسی آواز مدھم پڑتی گئی اور گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز واضح ایک دم واضح سُنائی دینے لگی۔ اب سائرن جیسی آواز بالکل معدوم ہوچکی تھی اور گھوڑوں کی ٹاپیں کانوں میں دھمک ڈال رہی تھیں۔

آواز قریب آتی گئی ـــ قریب ـــ اور قریب۔

چندر بھان کی ماں اور بیوی ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھیں۔ بچّے بھی اُٹھ گئے اور سہمی سہمی نظروں سے چندر بھان کی طرف دیکھنے لگے۔ گھوڑوں کی ٹاپیں جیسے چندر بھان کی کھوپڑی پر پڑ رہی تھیں۔ پھر اُسے لگا سیکڑوں گھُڑسوار اُن کے گھر کے سامنے والی سڑک پر سے اُڑتے چلے جارہے ہیں۔ گھوڑوں کی دھمک سے مکان کی دیواریں کانپنے لگیں۔ اُسی شور کے درمیان چندر بھان نے محسوس کیا کہ ایک گھُڑسوار ٹھیک اُن کے گھر کے سامنے آکر رُک گیا ہے۔ پھر کوئی بھاری قدموں سے گھر کے سامنے والی پتھریلی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ اُن سب کے چہرے سفید پڑ گئے ـــ چندر بھان نے کچھ کہنا چاہا۔ مگر اُس کے گھر والوں کی خوف زدہ آنکھوں نے اُس کے حلق میں پھندا لگا دیا۔

اُس نے اپنی جگہ سے ہلنا چاہا۔ مگر اُسے لگا اُس کی ٹانگیں کسی بگلے کی ٹانگوں کی طرح پتلی، لاغر اور لمبی ہو گئی ہیں اور یہ کہ اگر وہ ایک قدم بھی چلا تو لڑکھڑا کر وہیں ڈھیر ہو جائے گا۔ باہر بھاری قدموں کی چاپ دروازے پر آ کر رُک گئی۔ پھر کوئی دروازے کی زنجیر ہلانے لگا۔ کھڑ، کھڑ ــــ کھڑ، کھڑ ــــ اور دوسرے ہی لمحے اُن کے جواب کا انتظار کیے بغیر پلٹ کر تیزی سے سیڑھیوں سے نیچے اُتر گیا۔ اُس کے فوراً بعد گھوڑے کی ہنہناہٹ سنائی دی اور ساتھ ہی گھوڑے کی ٹاپ جو دُور جاتی سیکڑوں گھوڑوں کی ٹاپوں میں مدغم ہوتی جا رہی تھی۔

پتا نہیں چندر بھان اور اُس کے گھر والے آنکھیں پھاڑے اور منہ کھولے کب تک بیٹھے رہتے۔ آخر چندر بھان ہی نے اپنے آپ کو سنبھالا اور کھنکار کر بولا۔

"کون ہو سکتا ہے؟"

کوئی کچھ نہیں بولا۔

"میں دروازہ کھول کر دیکھتا ہوں۔"

"نہیں ــــ ہیں ــــ ہیں ــــ" یک بہ یک اُس کی بیوی چیخ پڑی۔

ماں بولی ــــ "نہیں بیٹا، ہم تجھے یوں باہر نہیں جانے دیں گے۔"

باپ چُپ تھا۔

"مگر دیکھنا تو ہوگا کہ کون تھا ــــ اس طرح زنجیر ہلا جانے کا مطلب کیا ہے؟ ہو سکتا ہے ہمارا کوئی دوست ہو۔"

"دوست ــــ!" باپ کی پیشانی سلوٹوں سے بھر گئی۔

"بہ ہر کیف کوئی بھی ہو۔ ہمیں دروازہ تو کھولنا ہی ہوگا۔ کوئی ہمارے دروازے کی زنجیر ہلا جائے اور ہم بے حس بیٹھے رہیں۔ یہ کوئی اچھی بات تو نہیں۔"

"نہیں بیٹا ــــ اتنی رات گئے ــــ کون دوست ہو سکتا ہے؟ پتا نہیں کوئی بلا ہو"
"میں نہیں مانتا اور اب رات کا آخری پہر ہے۔ تھوڑی دیر میں صبح ہونے والی ہے۔"
"بیٹا، ضد نہ کرو۔" ماں گڑگڑائی۔
"بھگوان کے لیے آپ باہر مت جایئے۔" بیوی منت کرنے لگی۔
"ارے کمال کرتے ہیں آپ لوگ ــــ بھئی آخر کب تک ہم اس اندھیرے میں ڈرے سہمے بیٹھے رہیں گے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ وہ ہمارا دوست تھا۔
"چلو میں بھی تمھارے ساتھ چلتا ہوں۔" باپ آرام کرسی سے اٹھتا ہوا بولا۔
"چلیے ــــ" دونوں دروازے کی سمت بڑھنے لگے۔ ماں اور بیوی بچوں کو چھاتی سے لگائے سہمی سہمی نظروں سے انھیں دیکھتی رہیں۔ باپ بیٹے دروازے کے پاس جاکر رک گئے۔ تھوڑی دیر تک آہٹ لیتے رہے۔ پھر جوں ہی چندر بھان نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولنا چاہا۔ باپ نے اس کا بازو پکڑ لیا۔
"نہیں پہلے ــــ کھڑکی سے جھانک کر دیکھو۔" باپ نے سرگوشی کی۔
چندر بھان نے اثبات میں گردن ہلا دی۔ پھر دبے قدموں کھڑکی کی طرف مڑ گیا۔ ہلکے سے کھڑکی کی سٹکنی گرا دی اور کھڑکی کو ذرا سا کھول کر باہر جھانکنے لگا۔ باہر بدستور اندھیرا تھا۔ تھوڑی دیر تک اسے کچھ بھی سجھائی نہیں دیا۔ آخر چند لمحوں بعد جب اس کی آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کی عادی ہونے لگیں تو اس نے دیکھا کہ اردگرد کے بہت سے مکانوں کی کھڑکیاں بھی کھلی ہیں اور ان کھڑکیوں میں بھی بہت سی گردنیں لٹکی ہوئی ہیں۔ اس نے جلدی سے کھڑکی بند کر دی اور باپ کی طرف مڑ کر بولا۔
"پتا جی! لگتا ہے محلے کے لوگ جاگ گئے ہیں۔"

"چلو دروازہ کھول کر دیکھتے ہیں۔"

"ہاں — چلیے۔ ایک عرصے سے پھیپھڑے تازہ ہوا سے محروم ہیں۔"

چندر بھان نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ باپ بیٹے دونوں باہر نکل آئے۔ انھوں نے محسوس کیا کہ دھیرے دھیرے اردگرد کے مکانوں کے بھی دروازے کھل رہے ہیں اور لوگ ایک ایک دو دو کرکے باہر نکل رہے ہیں۔ چندر بھان اپنے مکان کی سیڑھیاں اترنے لگا۔ اس کے باپ نے پھر اس کی قمیص کا دامن پکڑ لیا۔

"رکو! سڑک پر جانے کی کیا ضرورت ہے؟"

چندر بھان سیڑھی ہی پر رک گیا۔ دوسرے مکانوں کی سیڑھیوں پر بھی کچھ سایے کھڑے تھے۔ چندر بھان نے مڑ کر باپ کی طرف دیکھا اور پھر کھنکار کر ذرا بلند آواز میں بولا۔

"ادھر کون ہے؟"

"تم کون ہو؟" ادھر سے آواز آئی۔

"میں چندر بھان ہوں —"

"میں سوریہ بھان ہوں —"

"اوہو —" چندر بھان نے اطمینان کا سانس لیا۔

"بھئی، ابھی ابھی کوئی ہمارے دروازے کی زنجیر ہلا گیا ہے۔"

"ارے!" سوریہ بھان کی آواز آئی۔ "ہمارے گھر کے دروازے کی بھی کسی نے کنڈی کھٹ کھٹائی تھی۔"

"ہماری بھی —"

"ہماری بھی۔"

مختلف سمتوں سے آوازیں آنے لگیں اور لوگ اپنے اپنے مکانوں کی سیڑھیوں سے اُتر اُتر کر سڑک پر آگئے۔

"آخر کون تھے وہ، جنھوں نے اس اندھیرے میں ہمیں گھروں سے باہر نکلنے پر مجبور کر دیا؟"

"ہاں کون تھے وہ لوگ؟"

"کوئی دوست؟"

"دشمن بھی تو ہو سکتا ہے۔"

"کہیں رات کے آخری پہر نکلنے والا شیطانوں کا کوئی قافلہ تو نہیں۔"

"لٹیرے بھی تو ہو سکتے ہیں۔"

"کسی نے ان کے چہرے دیکھے تھے۔"

"آخری سوال پر یک بہ یک چاروں طرف خاموشی چھا گئی — تھوڑے توقف کے بعد کسی کونے سے آواز آئی — "نہیں۔"

اور پھر چاروں طرف سے اُسی نہیں، نہیں کی تکرار ہونے لگی۔

"آخر ہم اُن کے چہرے کیوں کر دیکھ سکتے تھے۔ ہم سب اپنے اپنے مکانوں میں بند تھے اور باہر اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔"

"مگر ایک بات ہے۔ اتنی رات گئے ہماری زنجیریں ہلا کر بیدار کرنے والے دوست ہی ہو سکتے ہیں۔"

"مگر ہم لوگ سوئے ہی کب تھے کہ بیدار ہوتے۔ ہم تو محض خوف سے گھروں میں بند ہو گئے تھے۔"

"اف! اندھیرا اب بھی کتنا گھنا ہے۔"

"اس اندھیرے میں دوست، دشمن کی تمیز کیسے ہو کہ ہم خود اپنے چہرے بھی

نہیں دیکھ پا رہے ہیں۔

ایک کونے سے کافی گمبھیر آواز اُبھری "شاستروں میں لکھا ہے ...."

اِدھر اُدھر سے دو تین متجسّس آوازیں اُبھریں۔

"کیا لکھا ہے شاستروں میں؟"

مگر اس سے پہلے کہ وہ گمبھیر آواز آگے کچھ کہتی۔ ہوا کے دوش پر ویسی ہی سنساہٹ پھر سُنائی دینے لگی۔ جیسی کچھ دیر قبل سُنائی دی تھی۔ جیسے ہوا کسی جہاز کے بادبان میں پھنسی سسکیاں بھر رہی ہو۔ سنساہٹ تیز ہونے لگی — تیز اور تیز۔ سائرن کی طرح کانوں کے پردے چھید دینے والی۔ پھر اُسی سنساہٹ کے سینے سے سیکڑوں ہزاروں گھوڑوں کے ٹاپوں کی دھمک اُبھرنے لگی۔

"اوہو! پھر وہی آوازیں۔"

"شاید وہی زنجیر ہلانے والے واپس ہو رہے ہیں۔"

"پتا نہیں۔"

"چلو اپنے اپنے گھروں کو لوٹ چلیں۔"

"نہیں — یہ بڑی نا عاقبت اندیشی ہو گی۔"

"پھر کیا کریں؟"

"ہمیں دیکھنا ہو گا کہ یہ لوگ کون ہیں۔"

"کیا یہ ضروری ہے یہ وہی زنجیر ہلانے والے ہوں۔"

"ہو سکتا ہے ان میں زنجیر ہلانے والے بھی شامل ہوں۔"

"اگر وہ نہ ہوئے تو؟"

"اگر وہی ہوئے تب؟"

"کچھ بھی ہو ہمیں انتظار کرنا ہو گا۔"

"شاستروں میں لکھا ہے ...."

"ہاں، ہاں کیا لکھا ہے شاستروں میں؟" اِدھر اُدھر سے سیکڑوں مضطرب آوازیں اُبھریں۔

"شاستروں میں لکھا ہے کہ زنجیر ہلانے والے ...."

جملہ پھر ادھورا رہ گیا۔ ٹاپوں کی زبردست دھمک نے ایک بار پھر اُس آواز کا گلا گھونٹ دیا۔ چندر بھان کی رگوں میں ایک کپ کپی سی دوڑ گئی۔ اندھیرے میں چندر بھان نے دوسروں کو نہیں دیکھا مگر اسے یقین تھا کہ اُسی کی طرح دوسروں کے دل بھی اُن کی کنپٹیوں میں دھڑک رہے ہوں گے۔ ٹاپوں کی آواز قریب آتی جارہی تھی اور اندھیرے میں وہ سب گردنیں اُٹھائے آواز کی سمت دیکھ رہے تھے۔ ایک پُرخوف تجسس کے ساتھ۔

سنہ ۱۹۷۷ء

قصّہ دیوجانس جدید

کسی بستی میں ایک آدمی رہتا تھا۔ اسے کتے پالنے کا بڑا شوق تھا۔ اس کے پاس مختلف نسل کے کتوں کی ایک بڑی تعداد تھی۔ اس نے دُور دُور سے ہر رنگ و نسل کے کتے جمع کیے تھے۔ دیسی، بدیسی، چھوٹے، بڑے، اعلا نسل کے، ادنا نسل کے، کالے، بھورے، نارنجی، سفید، چتکبرے، خوں خوار، بردبار، اونچے، پستہ قد، شکاری، غیر شکاری، غرض وہ ساری قسمیں جن کا اُسے علم تھا اور جو دستیاب تھیں، اس نے جمع کرلیں۔ اس کے گھر میں ہر دم کتوں کے بھونکنے اور ان کے غرانے سے ایک عجیب سا شور رہتا۔ شاید اسی لیے اس کے گھر کو لوگ کتا گھر کے نام سے یاد کرتے تھے۔ اس کے اس جنون کی حد تک بڑھے ہوئے شوق نے لوگوں میں اسے نیم پاگل مشہور کر رکھا تھا۔ وہ لوگوں سے بہت کم ملتا۔ نہ وہ کسی کے گھر جاتا، نہ کوئی اس کے گھر آتا۔ ابتدا میں اس کے کچھ

دوست احباب بھی تھے۔ جن سے اس کی صاحب سلامت تھی۔ وہ لوگ کبھی کبھی
اس سے ملنے اس کے گھر چلے جاتے۔ مگر اس کے روز افزوں ترقی کرتے شوق
نے اس کے دوستوں اور عزیزوں کو اس سے بدظن کر دیا۔ جب بھی کوئی
اس سے ملنے جاتا وہ کتوں سے گھرا ہوا ملتا۔ اسے کئی کئی منٹ تک پتا ہی نہ چلتا
کہ کوئی اس سے ملنے آیا ہے۔ اگر کوئی کھنکار یا پکار کر اپنے آنے کا احساس دلاتا
تو وہ چونک پڑتا۔ کچھ لمحوں تک آنے والے کو اجنبی نظروں سے گھورتا رہتا۔ پھر۔
جب پہچان لیتا تو ــ "اوہو، تم ہو، آؤ، آؤ بیٹھو" کہہ کر پھر کتوں میں مست
ہو جاتا۔ اگر کوئی اس سے بات کرنے کی کوشش بھی کرتا تو وہ صرف ہوں، آں،
میں جواب دیتا اور کتوں کو چمکارنے، پچکارنے میں لگ جاتا۔ اگر بات کرتا بھی
تو گھما پھرا کر کتوں کے موضوع پر آجاتا۔ کتوں سے متعلق اس کی معلومات حیرت
انگیز تھیں۔ کتوں کے عادات و اطوار، ان کی خوراک، ان کی بیماریاں، مختلف نسلوں
کی مختلف خصوصیات، رنگ، نسل، خصلت وغیرہ پر وہ کچھ ایسی تفصیل سے
گفتگو کرتا کہ سننے والے کو محسوس ہوتا اگر وہ تھوڑی دیر تک اس کی باتیں سنتا
رہا تو جھنجلا کر اسے قتل کر بیٹھے گا یا کتے کی طرح بھونکنے لگے گا۔ لہٰذا آنے
والا جلد ہی سی نہ کسی بہانے سے اُٹھ جاتا اور پھر کبھی ادھر کا رُخ نہ کرتا۔ اس طرح
دن بہ دن اس کے ملاقاتیوں کی تعداد گھٹتی گئی۔ مگر کتوں کی تعداد میں برابر اضافہ
ہوتا رہا۔ ایک وقت ایسا آیا کہ لوگوں نے اس سے ملنا جلنا ترک کر دیا۔ اس سے
کترانے لگے بل کہ اس کے گھر کے پاس سے گزرنا ہی چھوڑ دیا۔ ہفتوں اس سے کوئی
نہ ملتا۔ کئی کئی دن تک اس کے احاطے میں انسانی شکل نظر نہ آتی۔ مگر اسے کبھی
بھی اس کا احساس نہیں ہوا۔ ایسا لگتا تھا اسے اپنے کتوں کے سوا دنیا میں کسی
اور چیز سے دل چسپی ہی نہیں ہے۔ وہ رات دن اپنے کتوں کی خدمت میں

لگا رہتا۔ اُنھیں کھلاتا، نہلاتا، ان کے پلوں کو تھپک تھپک کر سلاتا۔ ان کی ایک ایک حرکت کو غور سے دیکھتا۔ ان کی آوازوں کے اُتار چڑھاو، ان کا بھونکنا، ان کی غراہٹ، مختلف اوقات میں ان کی آواز میں پیدا ہونے والا تغیر، موسم کے اعتبار سے ان کے مزاج پر پڑنے والے اثرات، ان کا غصّہ، خاموشی، پیار، جنسی اختلاط غرض ان کی مختلف حرکات و سکنات اور ان کے ردعمل سے پیدا ہونے والے نتائج کا نہایت باریک بینی سے مشاہدہ کرتا۔ ایک ایک بات نوٹ کرتا۔ اسی طرح اس کے دن بیتتے رہے اور وہ لوگوں کی بحث کا موضوع بنا رہا۔ وہ لوگوں سے جتنا دور ہوتا جا رہا تھا اتنا ہی لوگوں کا تجسس بڑھتا جا رہا تھا۔

ایک دن اس نے اپنے ایک قریبی ملاقاتی کو بتایا کہ وہ 'کتوں کی فطرت' کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ انھیں کسی بھی چیز کے لیے جلد ٹرینڈ کیا جا سکتا ہے اور یہ کہ اس نے ان پر ایسے ایسے تجربے کیے ہیں کہ لوگ دیکھ لیں تو مشکل سے یقین کریں گے اور اب وہ کتوں پر ایک بہت اہم تجربہ کر رہا ہے۔ انھیں انسانی زبان سکھا رہا ہے۔ اگر وہ اس میں کامیاب ہو گیا تو جلد ہی وہ ایک بہت بڑی نمائش کرے گا، اور اس میں اپنے کتوں سے انسانی زبان میں گفتگو کرے گا۔ کتے بھی انسانی زبان میں جوابات دیں گے۔ اس کا ملاقاتی اس کی بکواس سے بور ہو کر اُٹھ گیا۔ مگر جلد ہی یہ بات ساری بستی میں پھیل گئی اور لوگ اس کا اور بھی مذاق اُڑانے لگے۔ لوگوں کو یقین ہو گیا کہ اب وہ بہت جلد پاگل ہو جائے گا۔ بھلا کتے بھی کہیں انسانوں کی طرح باتیں کرتے ہیں؟ کیا بکواس ہے۔

مگر کچھ لوگوں نے کہا کہ آج کی دنیا میں کچھ بھی ناممکن نہیں ہے۔ یہ تجربات کا زمانہ ہے، ممکن ہے وہ سچ مچ اپنے تجربے میں کامیاب ہو جائے۔ بعض کہتے اس نے کہیں سے سفلی علم سیکھا ہے اور بے شمار بد ارواح کو کتوں کے روپ

میں اپنے قبضے میں کر رکھا ہے۔" کوئی کہتا "اس کے پاس ایسے ایسے منتر ہیں کہ اگر وہ انسان پر پڑھ کر پھونک دے تو وہ جانور بن جائے اور جانور پر دم کر دے تو وہ انسان بن جائے۔" غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔ اب توہم پرست لوگ اس سے خوف بھی کھانے لگے۔ لوگوں نے اس کے گھر کے پاس سے گزرنا بھی چھوڑ دیا۔ پتا نہیں کب اچھا خاصا آدمی اس کے گھر کے پاس سے گزر رہا ہو اور اچانک کتے کی طرح بھونکنا شروع کر دے۔ لوگ اس کے سائے تک سے کترانے لگے۔ اس کی شخصیت بستی والوں کی نظر میں روز بہ روز پراسرار ہوتی گئی۔ ان کے دلوں میں اس کے لیے تجسس کے ساتھ ساتھ خوف بھی پیدا ہو گیا تھا۔

اسی طرح کچھ ہفتے بیت گئے۔ روزمرہ کی دوڑ بھاگ میں لوگ اس کے ذکر کو بھولنے سے لگے۔ دماغوں میں سلگتے تجسس کے شعلے مدھم پڑتے گئے۔ لوگ اس کے بارے میں اب بھی باتیں کرتے مگر ان کی باتوں میں وہ جوش و خروش باقی نہ رہا تھا۔

لیکن ایک دن اچانک لوگوں پر جیسے بجلی گری۔ جب انھوں نے سنا کہ وہ کل بستی کے سب سے بڑے میدان میں اپنے ٹرینڈ کتوں سے سوالات کرے گا اور کتے انسانی زبان میں جوابات دیں گے۔ لوگوں نے یہ بھی سنا کہ اس تجربے کی کامیابی کے بعد وہ دارالسلطنت میں بڑے پیمانے پر اپنے اس کارنامے کی نمائش کرے گا جس میں ساری دنیا کے اخباری نمائندے شرکت کریں گے۔ ایک ڈھنڈورچی نے تھالی پیٹ پیٹ کر مذکورہ اعلان کیا تھا۔ لوگوں کا سویا ہوا تجسس ایک دم سے جاگ پڑا۔ ہوٹلوں، پارکوں اور گھروں میں، گلیوں اور سڑکوں پر ہر جگہ لوگ کل ہونے والے تماشے کا ذکر کرتے دکھائی دینے لگے۔ ایک خوف بھرا تجسس ہر شخص کے دل میں کروٹیں لینے لگا۔ کچھ نوجوانوں نے اب بھی اس کے اعلان کو دیوانے کی بڑ کہا۔ مگر اکثر لوگ اس کے اس اعلان پر ایمان لے آئے۔

دوسرے دن وقت مقررہ سے پہلے ہی لوگ اس میدان میں جمع ہونے لگے۔ بچے بوڑھے، مرد عورتیں، لوگ جوق در جوق آتے اور دکانوں کے چھجوں کے نیچے، سڑک کے کنارے اور گھروں کے وراندوں میں کھڑے ہو جاتے۔ قریب کے مکانوں کی چھتوں پر بھی لوگوں کے سروں کا جنگل اُگ آیا۔ ہجوم لمحہ بہ لمحہ بڑھتا ہی جارہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ساری بستی امڈ آئی۔ لوگ زور زور سے اسی موضوع پر باتیں کررہے تھے۔ سب اپنی اپنی عقل کے مطابق اس متوقع تماشے پر خیال آرائیاں کررہے تھے اور سب کی نظریں اس کے گھر کی طرف سے آنے والی سڑک پر لگی تھیں۔

وقت مقررہ سے ٹھیک پانچ منٹ پہلے لوگوں نے دیکھا کہ وہ اپنے کتوں کی زنجیریں تھامے چلا آرہا ہے۔ سارے کتے گردنیں جھکائے، اپنی دموں کو پچھلی ٹانگوں میں دبائے انتہائی اطاعت گزاری کے انداز میں آگے بڑھ رہے رہے تھے اور وہ ان کے پیچھے گردن اکڑائے، فخر سے سینہ پھلائے ایک شان سے جھومتا چلا آرہا تھا۔ کم از کم ایک درجن کتے رہے ہوں گے۔ بہ ظاہر سب کے سب صحت مند اور پر ہیبت لگ رہے تھے۔ مگر غور سے دیکھنے پر لگتا تھا محض ان کی ہیئت کتوں جیسی ہے۔ ورنہ وہ درندگی جو عموماً کتوں کا خاصہ ہوتی ہے ان میں نظر نہیں آتی تھی۔ سب کے سب کنہیں پالتو بھیڑوں کی طرح انتہائی حلیم الطبع اور بردبار نظر آتے تھے۔ ایسا لگتا تھا اس نے انھیں انسانی زبان کے ساتھ ساتھ انسانی تہذیب کے اصولوں سے بھی روشناس کرادیا ہے۔ سارے کے سارے کتے اس قدر بے ضرر نظر آرہے تھے گویا کاٹنا، بھنبھوڑنا یا بھونکنا کبھی ان کی فطرت میں شامل ہی نہ رہا ہو۔ وہ جوں جوں قریب آتا گیا لوگوں کی بے چینی بڑھتی گئی۔ آوازوں کی بھنبھناہٹ میں اضافہ ہوگیا اور بے شمار

آنکھیں اس پر اور اس کے کتوں پر مرکوز ہوگئیں۔
وہ ایک شانِ بے نیازی سے دھیرے دھیرے چلتا بیچ میدان میں آ گیا۔ اس نے کتوں کو اپنے سامنے نیم دائرے کی شکل میں کھڑا کر دیا۔ جس طرح رِنگ ماسٹر عموماً شیروں کو کھڑا کرتا ہے۔ لوگوں کا تجسس بڑھتا جا رہا تھا۔ ان کے کان اس کی اور کتوں کی آواز پر لگے تھے۔ اس ان ہونی کو دیکھنے اور سننے کے لیے سب لوگ بُری طرح بے تاب تھے۔
وہ قریب رکھے ہوئے اسٹول پر کھڑا ہو گیا اور لوگوں نے اپنی سانسیں تک روک لیں۔ چاروں طرف ایک پُراسرار سناٹا چھا گیا۔ کہیں سے بھی کسی قسم کی آواز نہیں آ رہی تھی۔ سارے لوگ کاٹھ اور مٹی کے پتلوں کی طرح بے حس و حرکت کھڑے تھے۔ بس ان کی آنکھیں کھلی تھیں اور کان آواز پر لگے تھے۔
دفعتاً اس نے اپنے دونوں ہاتھ فضا میں بلند کیے، ایک لمحے تک مجمع کو گھورتا رہا۔ پھر کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا، مگر یہ کیا؟ کتے کے بھونکنے کی آواز؟؟
لوگوں نے حیرت سے دیکھا کہ وہ اسٹول پر کھڑا دونوں ہاتھ ہوا میں لہراتا کسی کتے کی طرح بھونک رہا ہے اور نیم دائرے میں کھڑے کتے انتہائی بے تعلق نظروں سے اسے گھور رہے ہیں۔

●

سنہ ۱۹۷۲ء

بیعت

یہ تو طے ہو چکا ہے کہ میں خودکشی کیے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ بہ ظاہر یہ بات بہت عجیب لگتی ہے۔ مگر یہ سچ ہے۔ میرے سامنے بس اب ایک ہی راستہ ہے خودکشی ـــــ خودکشی اور ذلیل زندگی کا طویل سلسلہ ......

میں ایک لمحے کو کیبن کے سامنے رکا۔ پھر جھٹکے سے چق ہٹا کر اندر داخل ہو گیا۔ بڑی میز کے پیچھے وہ اپنے چہرے پر اور رنگ زیبی جلال لیے کرسی پر براجمان تھا۔ اس کی نگاہیں تلوار کی طرح سیدھے میرے جسم میں گڑتی چلی گئیں۔ میں کسی خارپشت کی طرح سکڑ سمٹ کر ایک طرف کو کھڑا ہو گیا۔ ایر کنڈیشنڈ کیبن میں مکمل خاموشی تھی۔ مگر میرے کان میں سناٹا چیخ رہا تھا۔ میں اپنے آپ کو سہج بنائے رکھنے کی بہت کوشش کر رہا تھا۔ تاہم اندر سے مجھے لگ رہا تھا میں مکھن کے ڈلے کی طرح غیر محسوس

طریقے سے پگھلتا جارہا ہوں۔ میں اپنے آپ کو جتنا سمیٹنے کی کوشش کر رہا تھا اتنا ہی بکھرتا جارہا تھا۔

کشتی کے بادبان ٹوٹے ہوئے ہوں اور ہوائیں تیز ہوں تو جری سے جری ملّاح بھی گھبرا جاتے ہیں۔

ایر کنڈیشنڈ کیبن کی خاموشی میرے ذہن پر ہتھوڑے برسا رہی تھی۔ کاش کہیں سے کوئی شور اُٹھے، کوئی چیخ، کوئی کراہ، کوئی بم ہی پھٹے اور کسی طرح یہ سنّاٹا ٹوٹے، پھر چاہے میرے وجود کے پرخچے اُڑ جائیں اور میرا جسم روئی کے گالوں کی طرح فضا میں منتشر ہو جائے۔ ذہن مسلسل تکرار کر رہا تھا۔ کچھ تو ہو ـــــ کچھ تو ہو۔

آخر صدیوں کی خاموشی کو پھلانگ کر وہ سوال میرے کانوں سے ٹکرایا۔

"سُنا ہے تم نے نوٹس پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا ہے؟"

"جی ـــــ ہاں ـــــ" اگر میرے ہونٹ پتّھر کے بنے ہوتے تب بھی ان دو لفظوں کو ادا کرنے میں مجھے اتنی قوّت صرف نہیں کرنی پڑی ہوتی۔

"تم نے اس کے عواقب پر بھی غور کر لیا ہے؟"

مجھے لگا میرے چاروں طرف برچھیاں تنی ہوئی ہیں۔ زبان کھولی نہیں کہ ساری برچھیاں کھچ کھچ جسم میں دھنس جائیں گی۔ میں نے خشک ہوتے ہوئے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ کسی بلند عمارت سے گرتے ہوئے بدنصیب آدمی کی طرح انتہائی مایوسی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ پر زبان سے ایک لفظ نہ نکلا۔

وہ دوبارہ غرّایا ـــــ

"کیا تم جانتے ہو تم نے کیسا احمقانہ فیصلہ کیا ہے؟"

میں نے اپنے لہجے کو حتی المقدور سنبھالتے ہوئے کہا ـــــ "میں اپنی شخصی آزادی کا سودا نہیں کر سکتا۔"

"ادہو! ــــ" اچانک اس کے چہرے کی غضب ناکی سرد پڑگئی اور ہونٹوں پر ایک حقارت آمیز مسکراہٹ پھیل گئی ۔

"آزادی! ــــ توتم آزادی چاہتے ہو؟"

میں خاموش رہا ــــ اس کی کرخت آواز کیبن میں گونجی ۔

گھبراؤ نہیں ــ اگر تم چاہتے ہو تو تمھیں آزاد کر دیا جائے گا ۔ مگر یاد رکھو تمھاری زندگی کا انحصار صرف غلامی پر ہے ۔ غلامی جو زندگی کی لڑائی میں تمھیں رسد پہنچاتی ہے کیا تم اپنے ہاتھوں سے اِس رسد لائن کو کاٹ دینا چاہتے ہو؟"

وہ بولے جا رہا تھا اور مجھے محسوس ہو رہا تھا میرے گلے میں ایک مضبوط پھندا پڑا ہے جس کا ایک سرا اس کے ہاتھ میں ہے اور دھیرے دھیرے پھندے کا حلقہ تنگ ہوتا جا رہا ہے ۔ میرا سانس اکھڑنے لگا ۔ آنکھیں ابل پڑیں ۔ میں نے گردن کو ایک جھٹکا دیا ۔ پھندا کچھ ڈھیلا ہوا ۔ میں سنبھل کر گھٹی گھٹی آواز میں بولا ۔

"میں اس دفتر میں ملازم ہوں ، غلام نہیں !"

" بکواس مت کرو ۔ تم بھول رہے ہو کہ تمھیں ۲۴ گھنٹے کے نوٹس پر ملازمت سے علاحدہ کیا جا سکتا ہے ۔ تم ہو کس گمان میں ؟"

میں اندر ہی اندر لرز گیا ۔ ایر کنڈیشنڈ کیبن میں بھی میری پیشانی پر ہلکا ہلکا پسینا پھوٹ آیا تھا ۔ شاید اُس نے میری اندرونی گھبراہٹ کو بھانپ لیا ۔ قدرے توقف کے بعد اپنے لہجے کو نرم بناتا ہوا بولا ۔

" دیکھو! چپ چاپ اس نوٹس پر دستخط کر دو ۔ اس میں تمھاری بھلائی ہے ۔ سوال غلط اور صحیح کا نہیں ہے ۔ بل کہ سوال یہ ہے کہ تمھارے اکیلے کے انحراف سے اس ادارے کا کیا بگڑے گا ۔ یہ غیر دانش مندانہ فعل ہے ۔ اس میں سوائے تمھارے کسی کا کوئی نقصان نہیں ہو گا ۔"

مگر ـــ میرے ضمیر کی آواز ـــ"

اس نے بُرا سا منہ بنایا اور تیز لہجے میں بولا ـــ

"بکواس ہے۔ سب بکواس ہے۔ تم اپنے ضمیر کی آواز کو اسی دن قتل کر چکے تھے جس نے تم نے اس دفتر میں ایک وفادار ملازم کی حیثیت سے قدم رکھا تھا۔ کیا تم کوئی مہاتما یا مسیحا ہو؟ زہر کا پیالہ سب کے نصیب میں نہیں ہوتا سمجھے۔ تم گھر پریوار والے ایک سیدھے سادے آدمی۔ اتنی اونچی اونچی باتیں سوچنا تمھارا کام نہیں سکون سے نوکری کرو۔ گھر بار دیکھو اور ہر جھوٹ سچ کی طرف سے آنکھیں بند کرلو۔ اسی میں تمھاری بھلائی ہے۔ اب بھی کچھ نہیں بگڑا ہے۔ یہ نوٹس رکھا ہے۔ دستخط کرو اور سب ختم کرو۔ مجھے اتنا سب کہنے کی ضرورت اس لیے پڑ رہی ہے کہ تم اپنی حماقت سے اپنے بال بچوں کے قتل کا سبب بن رہے ہو۔"

سامنے میز پر وہی نوٹس رکھا ہوا تھا۔ جس کے حروف دور سے غیر واضح ہونے کے باوجود ان کا مفہوم کسی ہزار پلئے کی طرح میرے ذہن کو جکڑے ہوئے تھا۔ ایک بار جی میں آیا دستخط کر ہی دوں۔ سچ مچ میرے اکیلے کی مخالفت سے کیا ہونے والا ہے۔ اسٹاف کے سارے لوگ تو اس نا انصافی کو قبول کر چکے ہیں۔ یہ بھی سچ ہے کہ خودداری اور بانکپن تو اسی دن بک گئے تھے جس دن ملازمت کا طوق گلے میں ڈالا تھا ـــ مگر ـــ مگر اپنے ہی ہاتھوں اپنا گلا کیسے گھونٹ لوں۔ میں نے گردن اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ میری جانب ہی دیکھ رہا تھا۔ میں نے ہارے ہوئے لہجے میں کہا ـــ

"مجھے کل تک کی مہلت چاہیے۔"

وہ چند لمحوں تک مجھے بڑے غور سے دیکھتا رہا پھر ہلکے سے مسکرایا۔ اور بولا ـــ "اچھی بات ہے چلو یوں ہی سہی۔"

اف، اس کی وہ مسکراہٹ جیسے کوئی کند آری سے گردن ریتنے کی کوشش کر رہا ہو۔ میں اس سے اجازت لیے بغیر ترنت کیبن کے باہر آگیا۔

میرے چاروں طرف ایک جہنم سلگ رہا ہے۔ اگر میں فولاد کا بھی ہوا تو اپنے آپ کو پگھلنے سے کب تک بچائے رکھوں گا۔ ہم سب پتلے ہیں۔ موم، مٹی اور مختلف دھاتوں کے بنے ہوئے پتلے۔ ایک دن سب پگھل جانے والے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ کوئی پہلی بھاپ میں پگھل جاتا ہے کوئی دھیرے دھیرے پگھلتا ہے۔ پگھلتے سب ہیں۔ میں جب بھی اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی کوشش کرتا ہوں میرے پیروں تلے کی زمین سرکنے لگتی ہے۔ اپنے ہی گھر کی دیواریں مجھے چاروں طرف سے دبوچ لیتی ہیں۔ ہر دیوار کے پیچھے سے ایک چہرہ ابھرتا ہے۔ مجبور، شکستہ اور پُر حسرت۔

بیوی، بچی، بہن، بھائی ـــــ رشتوں کی ان صلیبوں کو ڈھوتے ڈھوتے میری کمر جھک گئی ہے۔ آنکھیں پتھرا گئی ہیں۔ میں کسی بھی لمحے لڑکھڑا کر ڈھیر ہو سکتا ہوں۔ مگر مجھے چلنا ہے، یونہی چلتے رہنا ہے۔ جب تک میں چلتا رہوں گا یہ سارے چہرے سایوں کی طرح میرے ساتھ چلتے رہیں گے۔

بیوی ـــــ بے رنگ و روغن دیوار کی طرح سپاٹ چہرہ۔

جوان بہن۔ خواہشوں کی ٹوٹی کگار سے ٹنگی ہوئی دو اداس آنکھیں۔

بھائی ـــ بے روزگاری کا بوجھ ڈھوتے شکستہ کاندھے۔

بچی ـــــ آندھیوں کی زد پر ٹمٹماتا چراغ ـــ ایک ہی ڈور سے کتنی ساری پتنگیں بندھی ہیں۔ ڈور جو میرے ہاتھ میں ہے۔ کیا اپنے ہی ہاتھوں اس ڈور کو کاٹ دوں؟ ڈور کٹ گئی تو ان پتنگوں کا کیا ہوگا؟ ڈور سے کٹ کر کدھر جائیں گے یہ سب؟ ـــ اُف.....

"کیا سو گئے؟"

"نہیں —"

"کب سے کہہ رہی ہوں۔ ایک ساڑی لا دیجیے۔ بالکل گل گئی ہے۔"

"ہم — اس مہینے کی تنخواہ پر ضرور لے لیں گے۔"

"خاک لے لیں گے۔ آپ تین مہینے سے یہی کہہ رہے ہیں۔"

"نہیں، اس مہینے ضرور —"

"پیچھے کے کمرے کا سارا پلاسٹر اکھڑ گیا ہے۔ چھت بھی کم زور ہو گئی ہے۔ برسات سے پہلے لکڑیاں بدلوا لیجیے ورنہ ایک دن سب زندہ دفن ہو جائیں گے۔ آپ کو تو گھر کی ذری فکر نہیں۔"

میں کچھ کہنے کے لیے منہ کھولتا ہوں۔ مگر الفاظ سجھائی نہیں دیتے پھر خاموش ہو جاتا ہوں۔

"بچی کی دوائیں آج بھی نہیں آئیں۔ ڈاکٹر کہہ رہا تھا اس کے بدن میں خون کی کمی ہے دودھ اور پھل دینے کو کہا ہے۔ آپ سن رہے ہیں؟"

"ہاں سن رہا ہوں۔ دودھ اور پھل دینے کو کہا ہے ڈاکٹر نے۔"

"ہاں — اور کچھ ٹانکس اور تیس انجکشن بھی لکھ دیے ہیں — روز ایک انجکشن —"

"اچھا — کل لے لیں گے۔"

'کل' — کتنا حسرت خیز، پُر فریب اور زندہ جاوید لفظ ہے۔ کبھی نہیں مرتا۔

"دوائیں لے آئے؟"

"کل لائیں گے۔"

"ساڑی لے آئے؟"

"کل لے آئیں گے۔"
"بچّی کے ٹانکس اور پھل ــــ ؟"
"کل ــــ"
اگر کل نہ ہوتا تو کتنے لوگ مایوس ہو ہو کر خودکشی کر چکے ہوتے۔ کل ہمیشہ آج کو زندہ رکھتا ہے ــــ کل ــــ ہاں مجھے کل فیصلہ کرنا ہی ہوگا۔ اقرار یا انکار۔
اقرار ــــ ایک متواتر لمبی موت کا پروانہ
انکار ــــ اپنے ساتھ مزید چار افراد کا قتل
"جاگ رہے ہیں آپ ؟"
"کیا ہے ؟"
"میں بہت دنوں سے ایک بات کہنا چاہتی تھی۔"
"ساڑی ......"
"نہیں ساڑی نہیں۔ اب جلدی سے فریدہ کے ہاتھ پیلے کروا دیجیے۔"
"کوئی اچھا بر ملے تو۔"
"آپ اچھے بُرے کی اٹکل لڑاتے رہیے۔ ایک دن سر پر ہاتھ رکھ کر روییے گا ــــ ہاں۔"
"کیوں بکواس کر رہی ہو۔"
"کانوں سُنی نہیں کہتی، آنکھوں دیکھی کہہ رہی ہوں۔"
"آخر ہوا کیا ؟ کچھ پھوٹو گی بھی۔"
"آج کل فریدہ کے لچھّن کچھ ٹھیک نہیں ہیں۔"
"یوں ہی ترسا ترسا کر بولو گی ؟"
"شرفو پہلوان اور فریدہ کے بیچ کچھ چل رہا ہے۔"

"کون شرفو؟ وہ کلب والا"
"ہاں وہی لچّا ـــــ"
"تم نے کب دیکھا؟"
"اشارے بازی تو کئی دنوں سے چل رہی تھی۔ آج اس نے ایک چھوکرے کے ہاتھ گجرا بھیج دیا۔ چھوکرے نے غلطی سے مجھے لاکر دے دیا"
"تم نے فریدہ کو ڈانٹا نہیں؟"
"نا ـــ بابا ـــ میں کیوں ڈانٹوں۔ ایک دفعہ دو لفظ کہہ دیے تھے تو اس نے پوری چالی میں مجھے بدنام کر دیا تھا۔ آپ نے بھی اسی کی طرف داری کی تھی۔ آپ بھائی ہیں۔ آپ جانیں اور وہ جانے ـــ میں کون ہوتی ہوں بولنے والی۔"
"شرفو کی تو پہلے ہی سے دو بیویاں ہیں"
"ہوں گی ـــ مجھے کیا معلوم ـــ"
فریدہ کا چہرہ آنکھوں میں گھوم جاتا ہے۔ مایوسی کی دھند میں ڈوبا ہوا اداس چہرہ ـــ سگائی ٹوٹے دو برس ہو گئے کہیں سے کوئی رشتہ نہیں آتا۔ آتا بھی ہے تو وہی منہ مانگا جہیز۔ جوڑے کے پیسے ـــ ہزار، دو ہزار، تین ہزار کہاں سے لائیں؟
شرفو! شرفو!! غنڈا، جواری، اس کی یہ مجال کہ اب شریف بہو بیٹیوں پر نگاہ ڈالنے لگا۔ سالا ایک تو ناک کے نیچے غلط دھندا کرتا ہے۔ تس پر ہماری ہی ناک پر چھری چلانا چاہتا ہے۔ ایک عرضی پر سالے کا دھندا بند ہو سکتا ہے۔ کل ہی چالی والوں کی دستخطیں لے کر ایک عرضی ٹھوک دی جائے۔ سالا بلبلاتا پھرے گا۔ سمجھتا کیا ہے اپنے آپ کو۔ پولیس آ کر پنڈی کرے گی۔ تب پتا چلے گا بچو کو ـــ مگر ـــ یہ فریدہ کو کیا ہوا۔ سوّر، خاندان کا نام ڈبو دے گی۔ حرام زادی کو سویرے دیکھوں گا۔

آنکھ لڑانے کے لیے کیا شرفو ہی رہ گیا تھا — شرفو — شرفو — مگر شرفو تو روز مجھے سلام کرتا ہے۔ غنڈا ہے مگر چالی میں کبھی کوئی دھاندلی نہیں کی۔ جوے کا کلب چلتا ہے تو کیا ہوا۔ سُنا ہے آگرہ روڈ پر نیا فلیٹ خریدا ہے۔ موٹر سائیکل پر گھومتا پھرتا ہے۔ قیمتی کپڑے پہنتا ہے۔ ہاتھ میں گھڑی، گلے میں سونے کی زنجیر، انگوٹھیاں گزرتا ہے تو گلی، 'جنت الفردوس' کی خوشبو سے مہک اٹھتی ہے۔ فریدہ شرفو۔ شرفو، فریدہ —

میرا سر چکرانے لگتا ہے اور بار بار فریدہ کا اداس چہرہ جس پر دو ملتجی آنکھیں جڑی ہیں اُبھرنے لگتا ہے۔ جس دن سے سگائی ٹوٹی ہے فریدہ نے میرے سامنے آنا ہی چھوڑ دیا ہے اتفاق سے کبھی آمنا سامنا ہو بھی جاتا ہے تو میں خود ہی نظریں چُرا کر نکل جاتا ہوں۔ احساسِ جُرم — کیوں نہ میں نے لڑکے والوں کی فرمائش پوری کر دی — تین ہزار ہی تو مانگ رہے تھے نا وہ لوگ — تین ہزار، صرف تین ہزار — کاش وہ لوگ روپیے نہ مانگتے ہوئے کچھ اور مانگتے۔ کچھ اور — میری جان، میرا جسم، چمڑی، خون، گوشت۔ میرا اپنا سب کچھ۔ بوٹی بوٹی اتار لیتے میری۔ مگر روپے — کتنا بے بضاعت ہے آدمی۔ وقت پر اس کے دام تین ہزار بھی نہیں لگتے۔ ابھی آدمی نے بھی آدمی کی صحیح قیمت نہیں آنکی ہے شاید۔ ایک لمحے کو بھی کبھی فریدہ سے نظریں ملتی ہیں تو لگتا ہے وہ ابھی میرا گریبان پکڑ کر چیخ پڑے گی۔

کیوں نہیں دیے بھیا! تم نے انھیں تین ہزار روپے کیوں نہیں دیے —؟ کیا تم میرے لیے تین ہزار بھی نہیں جٹا سکتے تھے کہیں سے؟ بولو — بولو — بولتے کیوں نہیں —؟

میں دو برس سے اپنے ہی گھر میں اپنی بہن سے منہ چھپاتا پھر رہا ہوں۔

اب یہ شرفو، نہیں فریدہ کا کوئی قصور نہیں۔ قصور تو سارا میرا ہے۔ فریدہ ایک

ترستی بلکتی جوانی ۔ پیاس لگنے پر پانی کی طرف ہاتھ بڑھانا کوئی دوش نہیں ہو سکتا۔ کسی علاقے میں قحط پڑا تھا تو لوگ اپنا ہی پیشاب فلٹر کر کے پی لیتے تھے ۔ کبھی کبھی پیشاب بھی زندگی کے لیے کتنا کار آمد ہوتا ہے ۔ ٹھیک ہے شرفو ہی سہی ۔

"سنو! کل میں شرفو سے مل رہا ہوں۔ جوئے کا کلب ہے تو کیا ہوا۔ آدمی اچھا ہے۔ فریدہ خوش رہے گی اور سب سے بڑی بات جہیز وغیرہ ......"

بیوی کب کی سو چکی ہے ۔ میں اُٹھ کر بیٹھ جاتا ہوں ۔ بیوی چت لیٹی ہے ۔ ساڑی جگہ جگہ سے مسک گئی ہے ۔ بلاوز بھی پھٹنے کو ہے ۔ اندر سے بریزیر جھانک رہا ہے۔ بغل میں بچی لیٹی ہے چھے برس کی ہوگی ۔ مگر تین برس سے زیادہ کی نہیں لگتی ۔ ہاتھ پانو لکڑی ہو گئے ہیں ۔ پیٹ دن بہ دن پھولتا جا رہا ہے۔ رنگ کتنا زرد ہے ۔ جیسے ہلدی مل دی گئی ہو ٹانکس، دوائیں، پھل، دودھ، انڈا ___ مشکل ہے ۔ شاید بچ نہیں پائے گی ۔ اندر کچھ چٹختا سا لگتا ہے ۔ ایک ٹک بچی کو دیکھتا ہوں ۔ پر زیادہ دیر تک دیکھا نہیں جاتا۔ سرھانے سے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر سگریٹ جلا لیتا ہوں ۔ سگریٹ کے دھوئیں میں بیوی اور بچی کے چہرے دھندلے پڑ جاتے ہیں ۔ اُٹھ کر دھیرے سے پچھلے کمرے کا دروازہ کھولتا ہوں ۔

فریدہ چٹائی پر گھٹنوں میں سر ڈالے سو رہی ہے ۔ کمال کی چارپائی ابھی تک خالی ہے ۔ یہ کمال ___ کیا کرتا ہے ؟ کہاں جاتا ہے ؟ اتنی رات گئے تک ___

"کیوں جی ! کمال بھائی کوئی نوکری کیوں نہیں کرتے ؟"

"ملے گی تو کیوں نہیں کرے گا ؟"

"ملتی کیوں نہیں ؟ اب پوسٹر چپکانا ، جلوس میں نعرے لگانا ، رات رات بھر جاگ جاگ کر کاغذ کالے کرنا بھی کوئی کام ہے ۔ خدا جانے اُن کے دوست وغیرہ بھی کیسے لٹے سیدھے لوگ ہیں ۔ سب کی حجامتیں بڑھی ہوئیں ۔ موٹے موٹے چشمے لگائے ۔ ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہنے سب کے سب جوکروں کی طرح لگتے ہیں ۔ آپ منع نہیں کرتے کمال بھائی کو ___ ؟"

میں اسے کیسے منع کروں ؟ مجھے یہ فیصلہ کرنے کا کیا حق ہے کہ وہ غلط ہے۔ میں نے خود زندگی میں کتنے صحیح فیصلے کیے ہیں۔ مگر ایک گھریلو عورت کو یہ سب سمجھانا کتنا مشکل ہے۔ میں ہر بار چپ ہو جاتا ہوں اور وہ کڑک مرغی کی طرح کڑکڑاتی رہتی ہے۔ شروع شروع میں اس کی کڑکڑاہٹ سے مجھے کوفت ہوتی تھی۔ مگر اب عادی ہو گیا ہوں۔

وہ بھی جانتی ہے کہ اُس کی برہمی، اُس کی چڑچڑاہٹ، اُس کی پریشانی سب بے نتیجہ ہے۔ مگر وہ بھی عادت سے مجبور ہے یہ سچ ہے کہ چڑیا کے پر باندھ دیے جائیں تو وہ اُڑ نہیں سکتی مگر پھڑپھڑا سکتی ہے نا!

میں کمال کی خالی چارپائی کے پاس آکر کھڑا ہو جاتا ہوں۔ اُس کے سرہانے کچھ چھپے ہوئے پمفلیٹس، کورے کاغذ اور تین چار کتابیں پڑی ہیں۔ سب سے اُوپر رکھی کتاب کو یونہی اُٹھا کر دیکھتا ہوں۔ کتاب پر لکھا ہے۔ "سبھاش چندر بوس ــــ ایک سوانح" دوسری کتاب پر نظر پڑتی ہے۔ الفاظ دُور ہی سے چمک رہے ہیں۔ "پابلو نرودا" میں کتاب کو اسی جگہ رکھ کر چپ چاپ لوٹ آتا ہوں۔ کمال کو اب کسی بھی چیز سے نہیں روکا جا سکتا اور کیا روکنے سے رُک جائے گا وہ ؟ اور پھر اُسے روکا ہی کیوں جائے ؟ اُس کا مستقبل ایک کھُلی کتاب کی طرح میرے سامنے ہے۔ خون اور بارود کی بُو کا ایک تیز بھبکا میرے نتھنوں سے ٹکراتا ہے۔ میں ایک جھرجھری سی لیتا ہوں۔ پھر سگریٹ کا ایک طویل کش ــــ پھیپھڑے سُلگ اُٹھتے ہیں۔ کمرے میں واپس آجاتا ہوں۔ بیوی اور بچّی اپنے اپنے جسم کی قبروں میں اسی طرح لیٹی ہوئی ہیں۔ میں باہر کا دروازہ کھول کر گیلری میں آجاتا ہوں۔ گیلری سنسان ہے۔ آخری سرے سے بوڑھے سالومن کے ہلکے ہلکے کھانسنے کے سوا دوسری کسی قسم کی آواز سُنائی نہیں دیتی۔ البتہ نیچے گلی میں سے رہ رہ کر کتوں کے بھونکنے کی آواز آجاتی ہے۔ میں ریلنگ پر جھُک کر چاروں طرف نظر دوڑاتا ہوں۔ اردگرد کی بلڈنگوں پر سکوت چھایا ہوا ہے۔ اکّا دکّا کھڑکیوں کو چھوڑ

کہ ساری کھڑکیاں تاریک ہو چکی ہیں۔ گلی بھی قریب قریب سنسان ہو چکی ہے۔ صرف شرفو کے کلب میں چہل پہل نظر آ رہی ہے۔ میرے سامنے ایک بار پھر شرفو کا چہرہ گھوم جاتا ہے۔ رانا پرتابی مونچھیں۔ بھرے گلے، ماتھے پر زخم کا گہرا نشان۔ پیچھے کو مڑے ہوئے گھنگریالے بال اور انگلیوں میں سلگتا سگریٹ۔ کتنے تعجب کی بات ہے کہ شرفو کے تصوّر کے ساتھ ہی فریدہ کا چہرہ بھی آنکھوں میں اُبھرنے لگا ہے۔ پھر دونوں چہرے آپس میں اس طرح اوپر تلے ہونے لگے کہ میں نے گھبرا کر جلدی جلدی سگریٹ کے دو تین کش لیے اور ٹرّے کو فرش پر ڈال کر پیروں سے مسل دیا۔

میں دوبارہ بستر پر آ کر لیٹ جاتا ہوں۔ کمرے میں نائٹ بلب کی مدھم روشنی پھیلی ہوئی ہے۔ نیند کا کوسوں پتا نہیں۔ دماغ بری طرح سلگ رہا ہے۔ دُور کسی مِل کا بھونپو چیخنے لگتا ہے۔ شاید ساڑھے گیارہ بج رہے ہیں ــــ ساڑھے گیارہ ــــ دل پر گھونسا سا پڑتا ہے۔ ٹھیک بارہ گھنٹے بعد، کل ساڑھے گیارہ بجے 'ہاں' یا 'نہیں' کا جواب دینا ہے۔ ہاں ــــ یا ــــ نہیں۔ بہ ظاہر سادے سے دو لفظ۔ مگر کتنی زندگیوں کی آبرو ہے ان کی مٹھیوں میں۔ بیوی کی ساڑی۔ بچّی کے ٹانکس، فریدہ کی خوشیاں، کمال کے خواب، ایک شکستہ سا مکان جس کا میں درمیانی ستون ہوں۔ میرے سرکتے ہی پورا مکان تاش کے گھروندے کی طرح ڈھے جائے گا۔ میرے کندھے ٹوٹ رہے ہیں، آنکھیں پتھرا گئی ہیں۔ ٹانگیں کانپ رہی ہیں۔ مگر نجات نہیں۔ اس بوجھ کو جھٹک دینا مشکل ہے۔ اس بوجھ کو اٹھائے رکھنا شاید میرا مقدر ہے۔ مجھے یہ بوجھ اُٹھانا ہی ہوگا۔ چاہے میرا اپنا وجود پارہ پارہ ہو جائے۔ میں اپنے غرور کو بچائے رکھنے کی خاطر اتنی ساری زندگیوں کا سودا نہیں کر سکتا۔

میرا دل دھڑکنے لگتا ہے۔ بدن میں ایک تشنج پیدا ہو جاتا ہے۔ میں ایک فیصلہ کن ارادے سے آنکھیں بند کر لیتا ہوں۔ ہاتھ پاؤں گل سے گئے ہیں۔ دماغ ایک دم سے سن

ہوگیا ہے۔ اب میں کچھ بھی نہیں سوچ رہا ہوں۔ سوچنے جیسا شاید اب کچھ بھی نہیں ہے۔

میں کیبن کی چق ہٹا کر اندر جاتا ہوں۔ ایک جوڑی تیز آنکھیں میرے دماغ کا ایکس رے لے رہی ہیں۔

"کیا سوچا ہے؟"

میں چپ رہتا ہوں۔

میری آنکھیں پیپر ویٹ کے شیشے میں قید چھوٹی سی گڑیا پر جمی ہیں۔

دوبارہ وہی سوال ______

"میں دستخط کرنے آیا ہوں" اپنی آواز پر میں خود ہی چونک جاتا ہوں ــ یہ آواز ــ جیسے کوئی ڈوبتا ہوا شخص گہرے کنویں سے چیخ رہا ہو۔

"ویری گڈ ـ" ایک بے رحم مسکراہٹ مجھے اندر تک چیرتی چلی جاتی ہے۔

"مجھے یقین تھا کہ تم صحیح فیصلہ کروگے۔"

میں کچھ نہیں کہتا، کچھ نہیں سنتا۔ جھک کر میز پر رکھے اس نوٹس پر دستخط کر دیتا ہوں۔ چپ چاپ۔

مگر نہیں ــ یہ دستخط کرنے والا شخص 'میں' نہیں تھا۔ میں، تو کل رات اپنی ہی چھت کے نیچے بستر پر مر چکا تھا۔

●

سنہ ۱۹۷۶ء

نچوکا

جانے یہ کیا ہوتا جارہا ہے دن بہ دن اسے ۔ جیسے کسی نے اس کے ہاتھ پیر باندھ کر کنویں میں پھینک دیا ہو اور وہ گہرے بہت گہرے ڈوبتی چلی جارہی ہو۔ ایک دم بے سہارا سی ۔ وہ چیخنا چاہتی ہے مگر اس کی چیخ خود اس کے کانوں میں گونج کر رہ جاتی ہے ۔ ان بے آواز چیخوں سے اس کے کانوں کے پردے پھٹے جارہے ہیں ۔ کچھ دنوں سے کسی چیز میں دل نہیں لگتا اس کا ۔ جی چاہتا ہے بس چپ چاپ پڑی رہے نہ ہلے نہ ڈُلے ۔ نہ بولے نہ سُنے ۔ یہ کیسی اداسی ہے جو دھیرے دھیرے اس کے وجود کے گرد مکڑی کے جالوں کی طرح تنتی جارہی ہے ۔ اس کا جی چاہتا ہے کہ وہ اپنے سارے کپڑے پھاڑ ڈالے اور اپنے گرد تنے ان جالوں کو نوچ نوچ کر پھینک دے ۔ کیوں ہوتا ہے ایسا ؟ کیوں ہو رہا ہے آخر ؟

بڑی دیر سے وہ چت لیٹی چپ چاپ چھت کو گھور رہی تھی۔ ٹھیک اس کے سر پر پنکھا گھوں گھوں کرتا گھوم رہا تھا۔ اگر یہ پنکھا چھت کی کڑی سے نکل جائے تو؟ اس نے دیکھا کہ گھومتے پنکھے سے اس کا کچلا ہوا سر ٹنگا ہے اور خون کے چھینٹے اڑ اڑ کر دیواروں کو رنگین بنا رہے ہیں۔

کائیں کائیں ــــ کائیں کائیں

اس نے گردن ترچھی کر کے دیکھا۔ ایک کوّا گیلری کی ریلنگ پر بیٹھا چلّا رہا تھا۔ وہ غور سے کوّے کو دیکھنے لگی۔ کتنے دنوں بعد اُسے کوّا دکھائی دیا تھا۔ اسے اپنے اندر کسی انجانے گوشے سے کوئی کلّا سا پھوٹتا ہوا محسوس ہوا۔ مگر دوسرے ہی لمحے کوّا اُڑ چکا تھا۔ اس کے اندر سر اٹھاتی وہ ننھی سی اُمنگ پانی کے بُلبلے کی طرح ٹوٹ کر ہوا ہو گئی۔

دھوپ گیلری کی ریلنگ سے نیچے پھسل گئی تھی۔ باہر چھجے سے لٹکتے گملے میں اکلوتا گلاب کا پھول اب کچھ پھیکا پڑ گیا تھا۔ اُس نے سویرے سوچا تھا کہ اسے توڑ کر بالوں میں لگائے۔ پھر ٹال گئی تھی۔ وہ کیا کرے؟ کچھ بھی تو اچھا نہیں لگتا۔ نہ پہننا، نہ اوڑھنا، نہ بننا نہ سنورنا، حتّا کہ پھول لگانا بھی نہیں۔ ایک عجیب دم گھونٹو سی دھند مسلّط رہتی ہے ہر وقت ذہن پر۔ ایسی بے نام سی دھند جسے کریدنے پر ہر منظر مزید دھندلاتا چلا جاتا ہے۔ دُور کسی مل کا بھونپو چیخا۔ وہ چونک پڑی۔ اُس نے کمرے میں لٹکی دیوار گھڑی کی طرف دیکھا۔

"اُدہو، وقت تو ہو گیا" وہ پھسپھسائی۔

فضا کی گھٹن کچھ اور بڑھ گئی۔ دیواریں سرک سرک کر اسے دبوچ لینے کو بڑھیں۔ چھت نیچے اُتر آئی اور چھت میں ٹنگا پنکھا اس کے سر میں گھرگھرانے لگا۔ اُف! کتنا ناقابلِ برداشت ہے یہ سب۔ وہ مر کیوں

نہیں جاتی؟ اس نے اپنی آنکھیں میچ لیں۔ اسے اپنے کمرے کا فرش دھیرے دھیرے زمین میں دھنستا ہوا محسوس ہوا۔ کیا وہ یہاں زندہ ہی دفن ہو جائے گی؟ اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔

آہ، شام قریب آ رہی ہے۔ کسی ڈائن کی طرح دانت نکوستی۔ کتنا ڈر لگتا ہے اسے اب شام سے۔ جیسے شام کا اندھیرا چھتوں پر نہیں اس کے دل پر اتر آتا ہو ہر روز۔ کتنی بھیانک ہوتی ہیں یہاں کی شامیں۔ بھیانک، بیزار کن اور نڈھال کر دینے والی۔ شام کے ساتھ کیوں یاد آ جاتی ہے اسے آج بھی —— رمبھاتی گائے، دُم اُٹھا کر دودھ پیتا بچھڑا، سُرخ دوپٹے کی طرح پھولی ہوئی شفق۔ پیپل پر شور مچاتی چڑیاں، سفید بگلوں کی ڈاریں، گئو دھولی سے دھندلائی پہاڑیاں، کیوں یاد آ جاتا ہے یہ سب۔ کاش اسے پچھلا سب کچھ بھول جائے، پر کیا اتنا سارا بھول جانا آسان ہے؟ ٹن ٹن، ٹن، ٹن۔

اشوک کے آنے کا وقت ہو رہا ہے، اب اُٹھ جانا چاہیے۔ اگر وہ نہیں اُٹھی اور اشوک نے اُسے اس طرح بستر پر السائے دیکھ لیا تو وہ بہت پریشان ہو گا —— کیوں طبیعت تو ٹھیک ہے؟ تمھارا چہرہ کیوں اترا ہوا ہے؟ چلو ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں۔ پکچر چلو گی؟

کیا مصیبت ہے۔ کیوں چاہتا ہے آخر اشوک اسے اتنا۔ کتنا خیال رکھتا ہے وہ اس کا، اس کے سر میں سچ مچ ہلکا ہلکا درد ہو رہا ہے۔ مگر وہ یہ بات اشوک سے نہیں کہے گی ورنہ وہ تُرنت دوڑا دوڑا جائے گا اور ڈاکٹر کو بُلا لائے گا یا ٹیکسی منگوا کر خود اسے ڈاکٹر کے پاس چلنے پر مجبور کرے گا۔ ہو سکتا ہے اس کا سر دبانے بیٹھ جائے۔ پھر وہ لاکھ روکے نہیں سُنے گا۔ اسے یاد ہے وہ کئی بار اس کی معمولی معمولی بیماری پر چھٹی لے کر اس کے پاس بیٹھ چکا ہے اب تو

وہ بیمار پڑنے سے بھی ڈرنے لگی ہے۔

وہ تو اسے جھوٹ موٹ بھی ناراض نہیں کرتا۔ اسے یاد تک نہیں آتا کہ اشوک نے کبھی اسے روٹھنے کا موقع دیا ہو۔ کتنا جی چاہتا ہے اس کا روٹھ جانے کو۔ جب وہ روٹھتی تھی تو گھر میں بابا اور ماں اسے کتنا مناتے تھے اور اس روٹھنے اور منے میں کتنا لطف آتا تھا۔ مگر اشوک کو منانا ہی نہیں آتا۔ وہ اسے روٹھنے کا موقع ہی کب دیتا ہے کہ منانا پڑے۔ وہ تو کبھی اس کی کسی بات کی مخالفت ہی نہیں کرتا۔ وہ کہے ہاں، تو ہاں۔ وہ کہے نا، تو نا — وہ اسے چھیڑنے کے لیے رات کو کبھی یوں ہی کہہ دیتی ہے — "آج نیند آرہی ہے۔" تب اس کے بدن پر رینگتا ہوا ہاتھ فوراً ہٹ جاتا ہے۔ نہ غصّہ نہ پھٹکار۔ نہ نوچ نہ کھسوٹ — بس ایک سپاٹ سی اثباتی تائید۔

"اچھّا تو نیند آرہی ہے — سو جاؤ — کل۔"

اور پھر تھوڑی دیر بعد کمرے میں گونجنے لگتے ہیں بے ہودے خرّاٹے۔

وہ بے حد جھلّا جاتی ہے، غصّہ، ندامت اور ذلّت سے اس کے دل کی عجیب کیفیت ہو جاتی ہے۔ اس کے جی میں آتا ہے وہ اتنے زور سے چیخ پڑے کہ پاس پڑوس والے جاگ جائیں۔ اشوک گھبرا کر اُٹھ بیٹھے اور وہ اپنے لمبے لمبے ناخنوں سے اس کا منہ نوچ ڈالے۔ مگر وہ ایسا کچھ بھی نہیں کر پاتی۔ نہ چیختی ہے نہ چلاتی ہے، نہ اشوک کا منہ نوچتی ہے۔ بس چپ چاپ پڑی رہتی ہے آنکھیں چھت پر گڑائے۔ گھڑی کی ٹک ٹک کے ساتھ رات کا سنّاٹا اس کے کانوں میں چیختا رہتا ہے — چیختا رہتا ہے۔

"شالو ——— شا ——— لو ———"

ندی کے کنارے سیپیاں اور پتھر چنتے وہ کتنی دور دور نکل جاتی تھی۔

کملا پریشان ہو جاتی اور اسے پکارتی ہوئی اس کے پیچھے پیچھے بھاگتی رہتی۔
"شالو چل گھر چلیں، بہت دیر ہو گئی!"
"ٹھہر نا تھوڑی دیر، کتنا تو مزا آرہا ہے، تجھے نہیں آتا؟"
"آتا ہے، مگر تو تو ندی کے کنارے آکر جیسے پاگل ہو جاتی ہے۔"
"ہاں رے، مجھے سچّی یہاں بہت اچھّا لگتا ہے۔ کتنا اچھا ہوتا اگر میں ایک مچھلی ہوتی، ایک چھوٹی سی مچھلی۔ پانی میں کیسا ڈبک ڈبک تیرتی۔ ندی کے اس کنارے سے اس کنارے تک۔"
"اور رات کو کہاں سوتی؟"
"چاند کی کشتی میں۔ رات کو چاند ندی میں نہانے آتا ہے نا۔ میں اس میں بیٹھ جاتی اور رات بھر ندی کی خوب سیر کرتی۔"
"تو تو پاگل ہے —"
کملا بڑی مشکل سے اس کی چوٹی پکڑ کر گھسیٹتی ہوئی اسے واپس گھر لے آتی کبھی کبھی وہ دونوں ندی کے کنارے ریت پر کتنا بھاگتیں۔ ریت کے گولے بنا کر ایک دوسرے کو مارتیں، لوٹیں لگاتیں، ایک دوسرے سے لپٹتیں۔ اٹھتیں اور پھر گر جاتیں ندی کے کنارے اس کا دل ہمیشہ آوارہ پنچھی کی طرح ہوا میں اُڑتا رہتا۔ اور اب یہاں —— اس نے اپنے گرد کھڑی ننگی اور سخت دیواروں پر نظر ڈالی جو چاروں جانب سے اس پر جھکی ہوئی تھیں۔ اسے لگا وہ ایک ممی ہے، ہزاروں برس پرانی مصری ممی اور یہ کمرہ ایک بہت بڑا تابوت —— اس نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ اسے اچانک لہلہاتے کھیتوں، اُبلتے جھرنوں اور گنگناتی ندیوں سے اُٹھا کر یوں ان تنگ اور کڑی دیواروں میں قید کر دیا جائے گا۔ وہ تو جنگل کا پھول تھی۔ اسے گملے میں کس نے روپ دیا۔ ؟ بے چارہ گملے کا گلاب۔

اس نے باہر گملے میں کھلے گلاب کو تاسّف آمیز نظروں سے دیکھا۔
اس کے گھر کے سامنے بھی ایک بگیا تھی۔ کیسے کیسے پھول کھلتے تھے اس میں۔ لال، پیلے، اودے، گلابی۔ جب وہ پھول توڑنے لگتی تو بھونرے کتنا پریشان کرتے اسے۔ بار بار اس کے کانوں کے پاس گُن گُن کرتے رہتے۔ کالے کالے بدصورت بھنورے جب سندر سندر پھولوں کے گرد منڈلاتے تو اُسے بڑا غصّہ آتا۔ اسے بھنوروں کی ــــ گن گن ــــ کبھی اچھی نہ لگی۔ شادی کی پہلی رات کو جب اشوک اس کے کان میں پھسپھسایا "تم کتنی سُندر ہو" تو اسے جانے کیوں ان بھنوروں کی گن گن یاد آگئی تھی۔ وہ پہلی رات ہی کو سمجھ گئی تھی کہ اشوک اسے مر مٹنے کی حد تک چاہتا ہے۔ اس کے ایک اشارے پر وہ جان تک دے سکتا ہے اور اب شادی ہوئے اتنے دن بیت گئے، وہ برابر اس کے کانوں میں گن گن کیے جا رہا ہے۔ کچھ بھی ہو اس شدید چاہت کے نتیجے میں اسے اپنے آپ سے شرم آنے لگی ہے۔ اسے نہیں چاہیے ایسی چیپچپی محبت جو اس کے دل کو سیراب کرنے کی بجائے ہر لمحہ خالی پن سے بھر دیتی ہے۔ وہ کیسے کہے اشوک سے کہ وہ اتنا پیار نہ کرے کہ اسے اس کا یہ چیکو پن قطعی اچھّا نہیں لگتا۔ دفتر سے چھوٹ کر وہ چکرّ گھنی کی طرح گھومتا رہتا ہے اس کے گرد گُن گُن گُن۔ شام کو جب وہ گھومنے نکلتے ہیں تو وہ راستے بھر اس کا ہاتھ پکڑے چلتا ہے، موٹروں، رکشوں اور بھیڑ بھڑکّے سے بچتا بچاتا۔ جیسے وہ کانچ کی بنی ہے کہ ذرا کسی کا دھکّا لگا اور ریزہ ریزہ بکھر جائے گی۔ ایک لمحے کو بھی اس کا ہاتھ نہیں چھوڑتا۔ اسے ایسا لگتا ہے جیسے وہ آج بھی سات آٹھ برس کی شالو مینا ہے اور اس کا بابا اسے گانو کا میلا دکھانے لے جا رہا ہے۔
"بابا مجھے گڈّا دلاو نا ــــ"

"دلائیں گے۔"
"بابا! وہ چابی والا بندر۔"
"اے کھلونے والے وہ بندر کیسے دیا؟"
"بابا میری اُنگلی چھوڑ دونا۔"
"نہیں بیٹا، بھیڑ بہت ہے، بھٹک جاؤگی۔"
اس کی کتنی خواہش تھی کہ وہ میلے میں اکیلی گھومتی ہوئی دُور تک نکل جائے۔ خوب گھومے، بھٹکے اور تھک کر چُور ہو جائے۔ مگر وہ اس وقت سچ مچ بہت چھوٹی تھی ـــــ اچانک اس پر جھلّاہٹ سوار ہو جاتی اور وہ اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتی ـــ اشوک ہاتھ چھوڑ دیتا۔ مگر دوسرے ہی لمحے اس کا بازو اس کی کمر کے گرد لپٹ جاتا اور وہ بے بسی سے ایک طویل سانس لے کر اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دیتی ـــ وہ اسے سہارا دیے فٹ پاتھ پر چلتے لوگوں کے دھکوں، مکوں اور سڑک پر دوڑتی سواریوں سے اس طرح بچتا بچاتا چلتا ـــ جیسے وہ گانو میں کبھی کبھی بوڑھی جمنا میا کی لاٹھی پکڑے اسے راستہ پار کراتی تھی ـــــ ایسے موقع پر اس کا کتنا جی چاہتا کہ کوئی تیز رفتار موٹر کار یا ٹیکسی آئے اور انھیں کچلتی ہوئی نکل جائے یا کوئی چنگھاڑتی ہوئی بس انھیں گیندوں کی طرح یوں اچھال دے کہ وہ دونوں چھٹک کر ایک دوسرے سے دُور دُور بہت دُور جا پڑیں۔
وہ لوگ جب کسی ٹرین یا بس کا سفر کر رہے ہوتے تب بھی اشوک اس سے اس طرح سٹ کر بیٹھتا کہ اس کے پسینے کی بُو اس کے نتھنوں سے ٹکراتی رہتی۔ اگر اتفاقاً اسے صرف بیٹھنے کی جگہ ملتی اور وہ کھڑا رہتا تو اسے کنکھیوں سے دیکھتی رہتی۔ وہ ایسے موقع پر کتنا مضطرب نظر آتا۔ مضطرب اور قابلِ ترس۔ پھر جیسے ہی کسی اسٹیشن یا اسٹاپ پر اس کے بغل والی سیٹ خالی ہوتی تو وہ لپک کر اس کے

اس کے پاس آ بیٹھتا اور ایسا ہشاش بشاش دکھائی دیتا جیسے کسی کو اس کا گم شدہ بٹوا اچانک مل جائے۔ تھیٹر میں بھی وہ اکثر کارنر والی سیٹیں ریزرو کرالاتا اور اسے کارنر والی سیٹ پر بٹھاتا اور جوں ہی تھیٹر میں اندھیرا ہوتا وہ اس سے اس طرح چپک کر بیٹھتا کہ وہ اس کی گرم گرم سانسیں اپنے کندھے پر محسوس کرتی۔ وہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر پیار سے سہلاتا رہتا اور اس کا پکچر دیکھنے کا لطف خاک میں ملتا رہتا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اشوک کی اس شدید چاہ کے پیچھے اس کی محبت ہے یا اسے دوسرے مردوں سے بچائے رکھنے کی حکمت۔ وہ اس کی غیر موجودگی میں بھی ہر دم یہ محسوس کرتی رہتی کہ وہ قریب ہی کہیں بیٹھا ہزار آنکھوں سے اس کی جانب نگراں ہے۔ آخر یہ کیسا رشتہ ہے جو کسی بے تال کی طرح ہر پل اس کی ہستی کا تعاقب کرتا رہتا ہے۔ یہ کیسا پیار ہے جو ہر موڑ پر بھوت بن کر ڈراتا ہے اسے۔ شادی کو ایک برس بیت گیا مگر اشوک کے اپھنتے ہوئے پیار میں ذرا بھی ٹھہراو نہیں آیا ہے۔ وہ اب روزانہ کی اس بے رس چاہت سے اکتانے لگی ہے۔ مگر اشوک اس روٹین کو اتنی پابندی سے دہراتا ہے جیسے کوئی کند ذہن بچّہ اپنا رٹا ہوا سبق یاد کر رہا ہو۔

وہی صبح اٹھنا، نہانا، دھونا، ناشتا، دفتر، شام کو واپسی — رات ہوتے ہی وہ روز کی طرح گھر کے کاموں سے نپٹتی رہتی اور اشوک اس کے آس پاس ہی منڈلاتا رہتا۔ پھر دودھ گرم ہوتا، کپڑے بدلے جاتے۔ بستر پر لیٹ کر کسی رسالے کی ورق گردانی کی جاتی۔ اس بیچ اشوک برابر اسے پرچاتا رہتا۔ دھیرے دھیرے سانسیں تیز ہونے لگتیں۔

پھر وہ اس کے بدن پر دھیمے دھیمے ہاتھ پھیرتا۔ جیسے اس کا بدن ریشم یا مخمل کا دوشالہ ہو۔ ایک سرد لہر اس کی شریانوں میں دوڑنے لگتی اور اپنے

شوہر کا ہر لمس اس کے اندر ایک عجیب سی لجلجاہٹ بھرتا چلا جاتا۔ اس لجلجے سمندر میں ڈوبتے اتراتے اسے پتا ہی نہیں چلتا کہ کب ٹیبل لیمپ آف ہوا اور کب وہ ایک جانے پہچانے کالے گھنے اندھیرے کے حوالے کر دی گئی۔ چڑھتی گرتی سانسوں کے درمیان جب اس کے ہوش ٹھکانے لگتے تو وہ محسوس کرتی کہ کمرے میں زیرو پاور کا بلب دھندلی دھندلی روشنی پھینک رہا ہے اور فضا ہسپتال کے ایمرجنسی وارڈ کی طرح کرب ناک ہو گئی ہے ....

..... تب جانے کیوں اسے لگتا اس کے چاروں طرف سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے اور وہ دو گھونٹ ٹھنڈے اور میٹھے پانی کو ترس رہی ہے۔ پیاس کے مارے اس کے حلق میں کانٹے سے پڑ جاتے۔ ایک عجیب دہشت، پچھتاوے اور کراہیت سے اس کا دل کانپ جاتا اور وہ آنکھیں بند کر کے تکیے میں منہ چھپا لیتی ...

.... اس کا بدن کسی کٹے درخت کے تنے کی طرح بے جان ہو جاتا۔ اشوک دوبارہ بتی جلاتا۔ گلاس میں رکھا دودھ پیتا۔ دوسرا گلاس اسے پیش کرتا۔ مگر وہ اس قدر تھک چکی ہوتی کہ اٹھ کر دودھ پینا تو کجا آنکھیں کھول کر دیکھنا بھی اسے دوبھر معلوم ہوتا۔ اکثر اس کے حصّے کا دودھ یا تو خود اشوک پی جاتا یا سویرے تک جوں کا توں پڑا رہتا۔ صبح سے شام تک اور شام سے صبح تک سب کچھ ایک دم سوچا سمجھا، بندھا ٹکا، ایک جیسا۔ جیسے گھڑی کی سوئیاں ایک گھیرے میں ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتی رہتی ہیں — ٹک ٹک ٹک ٹک۔

وہ بہت اکتا گئی ہے اس سب سے۔ کبھی کبھی تو وہ عجیب و غریب خواب دیکھنے لگتی ہے اس کا شوہر رات گئے بے حد نشے میں گھر لوٹا ہے اور جانے کس بات پر ناراض ہو کر اسے بری طرح پیٹ رہا ہے۔ اس کا بدن لہو لہان ہو گیا ہے

مگر سب سے زیادہ حیرانی کی بات یہ ہے کہ اتنا پٹنے کے بعد بھی وہ چیخ چلا نہیں رہی ہے، نہ اس کی آنکھوں میں آنسو کی ایک بوند ہی ہے اسے اندر سے ایک عجیب سی راحت کا احساس ہوتا ہے۔ جیسے یک کر ٹیس مارتا پھوڑا اچانک پھوٹ جائے اور سارا مواد بہہ نکلے۔ کبھی دیکھتی ہے کہ کوئی ڈاکو اسے گھوڑے پر بٹھائے بھگائے لیے جا رہا ہے اور ایک پرچھائیں سی اس کے پیچھے چیختی چلاتی، دھول اڑاتی چلی آ رہی ہے۔ وہ اس پرچھائیں کو فوراً پہچان لیتی وہ اس کا شوہر اشوک ہوتا۔ مگر جانے کیوں اُسے اشوک پر ذرا ترس نہیں آتا۔ بل کہ اشوک کی اس بے کسی اور چھپٹ پٹاہٹ کو دیکھ کر اسے بڑی مسرّت ہوتی۔ ایک عجیب سی وحشیانہ مسرّت۔

مگر یہ سب خواب ہوتے۔ کبھی سوتے کے کبھی جاگتے کے۔ نہ اسے ڈاکو اٹھا کر لے جاتے ہیں نہ اشوک کسی دن نشے میں رات گئے گھر لوٹتا ہے۔ وہ روز اپنے وقت پر گھر آتا ہے۔ پھر سب اسی طرح ہونے لگتا ہے جیسا کل ہوا تھا اس سے پہلے والے کل ہوا تھا اور اس سے پہلے والے کل.......

"شالو! سُنا ہے تیرا پتی شہر کے کسی دفتر میں بابو ہے؟"

"ہاں!"

"تو بڑی بھاگیہ وان ہے ری۔ شہر بیاہ رہی ہے۔ ہم سہیلیوں کو یاد کرے گی کہ نہیں شہر جا کر۔" اور اس کے سینے میں ایک زور کی آندھی اٹھی تھی۔

"شالو، تو کچھ بول نہیں رہی ہے۔ تو نے اپنے ہونے والے پتی کو دیکھا تو ہے نا؟"

"ہاں!"

"کیسا ہے ری؟"

اس سوال کے ساتھ ہی جانے کہاں سے ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا تھا اور اسے اُڑا کر پیچھے بہت پیچھے ڈھکیل لے گیا تھا۔

دو برس پہلے وہ نویں جماعت میں تھی۔ اسکول کے میدان میں کبڈی کے مقابلے چل رہے تھے۔ آس پاس کے گانو سے بہت سے اسکولی لڑکے کبڈی کھیلنے آئے تھے۔ وہ، کملا، لتا، پشپا اور دوسری لڑکیاں اسکول کمیٹی کی جانب سے کھلاڑیوں کو اُن کی پاریوں کے بعد کھٹ میٹھی گولیاں تقسیم کرنے پر مامور تھیں۔

شاید وہ دھرم پور کی ٹیم کا لیڈر تھا۔ سانولا رنگ، پیتا پھل کے بیجوں جیسی کالی چمکیلی آنکھیں، کسا ہوا کسرتی بدن اور اونچا پورا قد — کبڈی کبڈی کرتا ہوا وہ جب پالے میں داخل ہوتا، وِرودھی دل میں کھلبلی سی پڑ جاتی۔ ایک بار تو وہ اپنے آنگن میں اکیلا رہ گیا تھا۔ اس کے سب ساتھی باد ہو چکے تھے۔ جب اس نے ورودھی دل پر چڑھائی کی تو اسے چاروں طرف سے گھیر لیا گیا۔ سب کی آنکھیں اسی پر جمی تھیں۔ شالو نے سانس تک روک لی تھی۔ پھر وِرودھی دل والے شور کرتے ہوئے ایک دم سے اُسے چھاپ بیٹھے۔ شالو کی تو ہلکی سی چیخ نکل گئی تھی۔ مگر دوسرے ہی لمحے اس نے دیکھا کہ وہ مچھلی کی طرح تڑپ کر اچھلا اور ان کے سروں پر سے گزرتا ہوا مدھیہ ریکھا پر آگرا۔ لوگ حیرت و خوشی سے چیخ پڑے۔ وِرودھی دل کے سات کھلاڑی باد ہو چکے تھے۔ اگلے تین منٹ میں کھیل کا فیصلہ ہو گیا۔ وہ آگے بڑھی۔ اس نے سب کھلاڑیوں کی ہتھیلیوں پر ایک ایک گولی رکھی۔ اُسے گولی دیتے وقت اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ گولی نیچے گر گئی۔

"او ہو چھما کرنا۔" کہتے ہوئے اس نے مارے گھبراہٹ کے اس کی ہتھیلی پر ایک ساتھ چار پانچ گولیاں رکھ دیں۔

"اتنی ساری ــــ ؟"

"ہاں کھا لیجیے — آپ کو پیاس لگی ہوگی۔"

"ہاں — پیاس تو لگی ہے۔" کہتے ہوئے اُس نے چاروں پانچوں گولیاں ایک ساتھ منہ میں ڈال لیں اور اس کی طرف دیکھ کر ہنسنے لگا۔ وہ بھی ہنس دی تھی۔ پھر شام کے تقسیم انعامات کے جلسے تک وہ اُس کے آس پاس ہی منڈلاتی رہی تھی۔ وہ بھی کبھی کبھی اُسے دیکھ لیتا تو مسکرا دیتا، بس — شام کے جلسے کے بعد کھلاڑیوں کی ٹولیاں اپنے اپنے گانو لوٹ گئیں۔ دھرم پور والے بھی چلے گئے — اور وہ بھی۔ اس کے بعد وہ اسے کبھی دکھائی نہیں دیا۔ مگر اُس دن اس سوال کے ساتھ ہی جانے کیوں وہ یاد آگیا تھا اسے۔ دھوپ میں تانبے کی طرح تمتمایا بدن، بازووں کی پھڑکتی مچھلیاں، ہر گھڑی مسکراتے ہونٹ اور سیتا پھل کے بیجوں جیسی کالی آنکھیں — شادی کے بعد ایک دن اشوک اسے اپنا البم دکھا رہا تھا۔

"یہ دیکھو، یہ میرے بچپن کا فوٹو — میں کتابیں لیے اسکول جا رہا ہوں۔ اس میں پھول سونگھ رہا ہوں، مغل نواب کے اسٹائل میں، اس میں گھاس پر لیٹا ہوں، اس میں اپنے دفتر کے ساتھیوں کے ساتھ — اس میں باس کے ساتھ —"

"آپ نے کبھی کبڈی کھیلی ہے؟" وہ اچانک پوچھ لیتی ہے۔

"کبڈی؟"

"میرا مطلب ہے اسکول یا کالج میں کبڈی کھیلتے ہوئے کوئی فوٹو نہیں ہے آپ کا؟"

"بالکل نہیں —" اشوک فخر سے گردن اکڑا کر کہتا ہے۔ "مجھے شروع ہی سے پڑھنے لکھنے کے سوا کھیلنے کودنے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ تم جانتی ہو میں بی۔ اے۔ میں پوری یونی ورسٹی میں اول آیا تھا۔"

وہ ایک دم چپ ہو جاتی ہے۔ اس دن کے بعد سے اسے اشوک کے البم میں کبھی کوئی دلچسپی محسوس نہیں ہوئی۔

شادی کے بعد اشوک اور وہ پہلی دفعہ گانو آئے۔ شام کو وہ اسے ندی کے کنارے لے گئی۔

"یہاں میں اور میری سہیلی کملا گھنٹوں سیپیاں چُنتی تھیں۔ گھٹنوں گھٹنوں پانی میں اتر کر مچھلیاں پکڑتی تھیں اور پھر انھیں زیادہ گہرے پانی میں چھوڑ دیتی تھیں۔ اچھا چلیے، آپ مجھے پکڑیے۔ میں بھاگتی ہوں۔ دیکھیں آپ ریت پر کتنا تیز دوڑ سکتے ہیں۔"

اشوک اسے پکڑنے کے لیے دوڑا تو تھا مگر دس قدم دوڑنے کے بعد ہی ہانپنے لگا اور وہ ہرنی کی طرح قلانچیں بھرتی کھیت کی مینڈ پر پہنچ گئی تھی۔ اس نے مڑ کر دیکھا اشوک ابھی ندی کے کنارے ہی پر تھا اور جھک کر کچھ تلاش کر رہا تھا۔ شاید دوڑنے میں اس کی عینک گر گئی تھی۔ اس کے سارے جوش پر اوس پڑ گئی۔

سامنے بیچ کھیت میں 'بجوکا' کھڑا تھا۔ جانے کیوں اس کے دل میں شدید خواہش اٹھی کہ اشوک کی عینک چھین کر بجوکا کو لگا دے۔ عینک لگائے بجوکا کیسا لگے گا۔؟ بغیر عینک کے اشوک عجیب لگ رہا تھا۔

اسے بجوکا کو دیکھ کر ہمیشہ بڑی ہنسی آتی تھی اور جب بھی وہ کھیت کے پاس سے گزرتی، بجوکا کو ایک آدھ پتھر ضرور مارتی ـــ اسے مزا آتا تھا بجوکا کو پتھر مارنے میں ـــ ویسے جب پہلی دفعہ اس نے بجوکا کو دیکھا تھا تو وہ کچھ ڈر بھی گئی تھی۔

وہ اس وقت بہت چھوٹی تھی۔

"بابا! یہ کپڑے کا آدمی کون ہے؟"

بابا نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔ "اری مُنیا! یہ آدمی نہیں بجوکا ہے۔"

"بجوکا کیا بابا؟"

"بجوکا کھیتوں کی رکھوالی کرتا ہے مُنیا!"

وہ ہنس دی ۔ "یہ کپڑے کا آدمی کھیت کی رکھوالی کیسے کرتا ہے بابا! یہ تو ہلتا ڈلتا بھی نہیں۔"

"وہ ہلتا ڈلتا نہیں۔ مگر پرندے اور جانور اس پتلے کو آدمی سمجھ کر کھیتوں سے دور رہتے ہیں۔"

تب سے جانے کیوں بجو کا کو دیکھتے ہی اس کے من میں اُسے پتھر مارنے کی خواہش جاگ اٹھتی ۔

"ٹن ـــــــــــ"

اوہو، ساڑھے پانچ ـــ اب تو اُٹھ جانا ہوگا۔ اشوک آتا ہی ہوگا۔

وہ پلنگ پر اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ سامنے الماری کے بڑے شیشے میں اُسے اپنی الجھی الجھی بکھری بکھری سی پرچھائیں دکھائی دی۔

کون ہے یہ؟ اس قدر بجھی بجھی، تھکی تھکی سی ـــ

اوہو، ایک برس میں کتنی بدل گئی ہے وہ۔ پہلے دن بھر کھیلتی کودتی، دوڑتی بھاگتی رہتی تھی۔ پھر بھی ذرا نہیں تھکتی تھی۔ اب تو وہ دن بھر لیٹی رہتی ہے پر کتنی تھک جاتی ہے ان چاہا آرام بھی کتنا تھکا دیتا ہے آدمی کو ـــ

اس کی نظر اپنے پیچھے لٹکتے اشوک کے بڑے سے فوٹو فریم پر پڑی۔ جو مسکراتا ہوا اسے گھور رہا تھا۔ ایک تیز خواہش اس کے دل میں چمک کر بجھ گئی، کہ وہ پتھر سے اس فوٹو پر ایسا نشانہ لگائے کہ فریم ایک تیز جھٹکے کے ساتھ چکنا چور ہو جائے۔ اور ـــ ٹھک ٹھک۔

اس کا دل اُچھل کر اس کے حلق میں آ اٹکا۔ اوہو شاید اشوک آگیا ـــ وہ مرے مرے قدموں سے دروازے کی جانب مڑ گئی۔

مکھوٹے

وہ ان مکھوٹوں کی وجہ سے بڑی کامیاب زندگی گزار رہا تھا۔ جب تک اس کے پاس یہ نقلی چہرے نہیں تھے اس کی شخصیت انتہائی غیر معروف تھی۔ اس کی نہ کہیں عزت تھی نہ کوئی اس کا رعب مانتا تھا۔ ایک چھوٹی سی نوکری بھی تو حاصل نہیں کر سکا تھا وہ۔ برسوں بھٹکتا رہا۔ باہر نہ دوستوں میں اس کی کوئی اہمیت تھی نہ گھر ہی میں کوئی اسے پوچھتا تھا۔ جلسوں، دعوتوں اور پارٹیوں میں اس کی طرف کوئی دھیان تک نہیں دیتا تھا۔ اول تو وہ کسی جلسے یا تقریب میں شریک نہ ہوتا اور اگر اسے مجبوراً شریک ہونا ہی پڑتا تو ہمیشہ سب سے پیچھے دبکا اور سہما سہما سا بیٹھا رہتا۔ جب تک بیٹھا رہتا ایک عجیب سا خوف اسے گھیرے رہتا کہ ابھی کوئی آئے گا اور بڑی بے عزتی کے ساتھ اسے نکال باہر کرے گا۔ عجیب گھبرائی سی زندگی گزار رہا تھا وہ۔ جیسے بغیر ٹکٹ کے

ریل کا سفر کر رہا ہو۔ ہمیشہ کوئی نہ کوئی خوف اُسے پریشان کیے رہتا۔ سڑک پر چلتے چلتے اس طرح چونک پڑتا جیسے کوئی اجنبی فساد زدہ علاقے سے گزرتے ہوئے چونک پڑتا ہے۔ اس نے تنہائی میں اپنے اس بے بنیاد خوف کی وجہ تلاش کرنے کی کوشش کی تھی۔ گھنٹوں اپنی بے وجہ گھبراہٹ کے بارے میں سوچا تھا، مگر اس کی جڑیں دریافت کرنے میں وہ ہمیشہ ناکامیاب رہا تھا۔

اور جب وہ اپنی زندگی سے بالکل تنگ آگیا اور ہر لمحہ بڑھتے ہوئے خوف نے اس کا سُکھ چین حرام کر دیا تو اس کے ذہن میں ایک خیال بجلی کی طرح کوند گیا۔ جیسے گہرے اندھیرے میں اچانک اُجالا ہو جائے اس کا باطن ایک دم سے روشن ہو گیا۔ اُسے محسوس ہوا کہ اب تک وہ گہری تاریکی میں ٹٹول ٹٹول کر چل رہا تھا۔ اچانک کسی غیبی طاقت نے اس کے چاروں طرف روشنی کا ایک ہالا سا تیار کر دیا ہے۔ اب وہ اپنے گرد بکھری ہوئی باریک سے باریک شے کو دیکھ سکتا تھا۔ ایک ایک ذرّہ اس کی نظروں کے سامنے اُجاگر ہو گیا تھا۔ اس دن سے اس کی شخصیت ہی بدل گئی۔ بل کہ اس کے لیے ساری دنیا بدل گئی۔ اس کے ارد گرد چلنے پھرنے والے لوگ کٹھ پتلیوں کی طرح اس کے اشاروں پر ناچنے لگے تھے۔

اسے تھوڑا سا افسوس بھی ہوا کہ یہ ترکیب اس کے ذہن میں پہلے کیوں نہیں آئی؟ برسوں اس نے ایک جانور کی طرح زندگی گزاری تھی۔ در در کی ٹھوکریں کھاتا پھرا تھا۔ نہ جانے کیسی کیسی چوٹیں سہی تھیں اپنی آتما پر۔ پھر اس نے سوچا ہر بات کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے۔ کچھ کھو کر ہی آدمی کچھ پاتا ہے۔ پھیلی ہوئی خوشیوں کے سامنے بیتے ہوئے دکھوں کو یاد کرنا فضول تھا۔ اب اس نے نئے سرے سے زندگی گزارنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ایک شان دار اور کامیاب زندگی اس کے سامنے دُلھن کی طرح سجی سجائی کھڑی تھی۔

اُسے اس طرح زندگی گزارتے بھی کئی برس ہو گئے تھے مگر اس کے راز سے کوئی بھی واقف نہ ہو سکا اور نہ اس نے اس راز میں کسی کو شریک کرنا مناسب سمجھا۔ اب وہ اپنے دوستوں میں ایک کامیاب ترین شخص شمار کیا جاتا تھا۔ وہ دوست جو پہلے اسے خاطر میں نہیں لاتے تھے، اب اس سے عزت سے پیش آتے۔ جو پہلے اس کی باتوں کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ اب ان کے لیے اس کا ایک ایک لفظ وحی کا درجہ رکھتا تھا۔ اب گھر میں بھی سب اس کی اہمیت سے واقف ہو چکے تھے۔ اس کے حکم کے بغیر گھر کا تنکا تک نہیں ہلتا تھا۔ خاندان اور برادری والے بھی اس کے مشورے کے بغیر کوئی کام نہیں کرتے تھے۔ جس فرم میں وہ کام کرتا تھا وہاں بھی سب اس کی راہ میں آنکھیں بچھائے رہتے۔ اس کے خلاف کوئی دم مارنے کی کی جرات نہ کرتا۔ وہ بھی اپنی موجودہ زندگی سے بے حد مطمئن تھا۔ مطمئن اور خوش۔ اور یہ سب انھیں مکھوٹوں کی وجہ سے تھا جو ہمیشہ اس کی جیب میں پڑے رہتے اور جنھیں وہ موقع موقع سے اپنے چہرے پر پہن لیتا تھا۔

صبح جب وہ آفس پہنچتا تو اس کے چہرے پر ایک بارعب اور حاکمانہ تیوروں کا مکھوٹا چڑھا ہوتا۔ اس کے جوتوں کی کھٹ کھٹ سنتے ہی چپراسی سے لے کر بڑے بابو تک سب ادب سے کھڑے ہو جاتے اور جب تک وہ اپنے کمرے میں داخل نہ ہو جاتا، نظریں نیچی کیے اپنے پانو کے انگوٹھوں کی طرف دیکھتے رہتے۔ وہ زلزلے کے ایک جھٹکے کی طرح ان سب کو گڑبڑاتا ان کے پاس سے گزر جاتا۔ ان کی گھبراہٹ بھری شکلیں دیکھ کر اسے ایک عجیب سفاکانہ مسرت کا احساس ہوتا۔ کمرے میں اس کے داخل ہوتے ہی تین منٹ کے اندر حاضری کا رجسٹر لا کر اس کی میز پر رکھ دیا جاتا۔

وہ دستخط چیک کرنے کے بعد بڑے بابو کو جو اس اثنا میں حاضر ہو جاتے ضروری ہدایات دیتا۔ وہ جب تک بولتا رہتا، بوڑھا کلرک جی حضور، جی سرکار کا ورد کرتا رہتا۔ بڑے بابو کے رخصت ہونے کے بعد وہ گھنٹی بجاتا فوراً چق اٹھا کر چپراسی حاضر ہوتا۔ وہ سگریٹ سلگاتا ہوا اپنی اسٹینوگرافر مس ماریا کو بھیجنے کے لیے کہتا۔ چپراسی الٹے قدموں لوٹ جاتا۔

پھر وہ جھٹ سے اپنے چہرے پر چڑھا آفسرانہ مکھوٹا اتار کر جیب میں ٹھونس لیتا اور ایک دوسرا مکھوٹا چڑھا لیتا۔ اب اس کی پیشانی پر وہ سلوٹیں نہیں ہوتیں جنھیں دیکھ کر اس کے ماتحت کانپنے لگتے تھے۔ آنکھوں میں نہ وہ بجلیاں کوندرہی ہوتیں جن سے ہمیشہ رعب و غصّے کی چنگاریاں نکلتی رہتیں بل کہ ہونٹوں پر ایک کومل اور دلآویز مسکراہٹ کھیل رہی ہوتی۔ مس ماریا اندر داخل ہوتے ہی گڈ مارننگ کہتی — جواب میں وہ بھی گڈ مارننگ کہتا اور وہ بڑی بے باکی اور بے حد دل فریب انداز میں میز کی بائیں جانب کرسی پر بیٹھ جاتی اور مسکراتی ہوئی ڈکٹیشن لینے کی منتظر رہتی۔ ایسا تقریباً روز ہی ہوتا تھا۔ پھر وہ بڑی دیر تک اپنی اسٹینو کو ضروری نوٹ بولتا رہتا۔ اس کی نرم اور میٹھی آواز سے پیار کے سوتے اُبلتے رہتے۔ اسٹینو کی انگلیاں تیزی سے چلتی رہتیں اور ساتھ ہی اس کی انگلیاں بھی....

مس ماریا کے واپس جانے کے بعد چپراسی اسے آکر اطلاع دیتا کہ اسے ڈائریکٹر صاحب نے سلام کہا ہے۔ وہ فوراً تیسرا مکھوٹا نکالتا اور اپنے چہرے پر جڑ لیتا۔ یہ مکھوٹا پہنتے وقت اسے ہمیشہ تھوڑی تکلیف ہوتی مگر وہ اس مکھوٹے کی اہمیت سے بھی اچھی طرح واقف تھا۔ اسی مکھوٹے کی بہ دولت اُسے اتنی بڑی نوکری ملی تھی۔ یہ رعب، یہ ٹھاٹ باٹ، عزّت

اسکوٹر، فلیٹ سب اسی مکھوٹے کے رہینِ منت تھے۔ اس لیے اس مکھوٹے کو پہنتے وقت جو تکلیف ہوتی وہ اُسے پی جاتا، کڑوی دوا کی طرح۔ اب اس کے چہرے پر تقریباً وہی سارے تاثرات نمایاں ہوتے جو ہیڈ کلرک کے چہرے پر اس کے کمرے میں داخل ہوتے وقت طاری رہتے تھے۔ جھکی ہوئی آنکھیں جن میں کرب اور خوشامد کی پرچھائیاں تیرتی رہتیں۔ کانپتے ہونٹ جن پر ایک چاپلوسانہ مسکراہٹ چپکی ہوتی۔ پیشانی سے ٹپکتی محکومی۔ لرزتے ہاتھ لڑکھڑاتے قدم۔ آواز میں لجاجت۔ وہ اس مکھوٹے کو پہننے کے بعد ایک دفعہ آئینے میں اپنی شکل دیکھتا اور پھر گردن جھکائے ہوئے ڈائرکٹر کے کمرے میں چلا جاتا۔ اپنی جیب میں ہر وقت پڑے ہوئے مختلف مکھوٹوں کو مختلف مواقع پر استعمال کر کے وہ اپنی چالاکی پر بڑا خوش تھا۔ اسے لوگوں کی سادگی اور لاعلمی پر بڑی حیرت ہوتی کہ لوگ کتنی آسانی سے دھوکا کھا جاتے ہیں۔

جب وہ آفس سے گھر لوٹتا تھا تب ان سارے مکھوٹوں کو لپیٹ کر رکھ لیتا اور ایک نیا مکھوٹا پہن لیتا تھا۔ اس مکھوٹے کی بھی اپنی ایک خصوصیت تھی۔ اسے پہن لینے کے بعد وہ ایک مکمل گھریلو آدمی بن جاتا تھا۔ اب وہ اپنی بیوی سے بے انتہا محبت کرنے والا شوہر، بچّوں کو پیار کرنے والا شفیق باپ اور اپنی بوڑھی ماں کا خدمت گزار بیٹا بن جاتا تھا۔ وہ گھر میں اپنے پہلے مکھوٹوں کی ہوا تک نہ لگنے دیتا تھا۔ اسی طرح اس کی بیوی یہی سمجھتی تھی کہ اس کا شوہر دنیا میں صرف اسی سے محبت کرتا ہے اور دوسری کسی عورت کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھتا۔ وہ بھی اُسے خوب پیار کرتی تھی۔ کون عورت ایسے شوہر سے پیار نہیں کرے گی۔ اس کی بوڑھی ماں بھی اپنے بیٹے کی خدمت گزاری سے بہت خوش تھی۔ بچے اپنے باپ کی شفقت کو دیکھ

کر پھولے نہ سماتے تھے ۔

وہ زندگی کے دن اسی طرح خوشی اور اطمینان سے گزار رہا تھا کہ اچانک اسے کچھ شبہہ سا ہوا ۔ شبہہ ہوا کہ صورتِ حال وہ نہیں ہے، جیسی وہ سمجھ رہا ہے ۔ پھر شبہہ بڑھتا ہی گیا ۔ ساتھ ہی اس کا سکون و اطمینان بھی ختم ہوتا گیا ۔ اب تو اسے شبہہ نہیں یقین ہو گیا تھا کہ وہ لوگوں کو فریب نہیں دے رہا ہے بل کہ ایک عرصے سے خود ہی فریب کھاتا آ رہا ہے ۔ اس نے چھپ چھپ کر اس بات کی تحقیق کی اور ہر دفعہ اس کا یقین پختہ سے پختہ تر ہوتا گیا ۔

اس کے ماتحت، اس کی اسٹینو، اس کے دوست احباب، عزیز اور رشتے دار حتیٰ کہ اس کی بیوی اور ماں بھی اس کے ساتھ چھل کر رہے تھے، اسے بے وقوف بنا رہے تھے اور وہ اب تک یہی سمجھ رہا تھا کہ وہ انھیں بے وقوف بنا رہا ہے ۔ کتنے بڑے فریب میں مبتلا تھا وہ ۔ اپنے آپ کو وہ بہت چالاک سمجھ رہا تھا ۔ مگر دھیرے دھیرے اسے معلوم ہو گیا کہ جسے وہ چالاکی سمجھتا آ رہا ہے وہ اس کی انتہائی سادگی تھی ۔ دوسروں کی مکاری کے سامنے اس کی چالاکی کچھ بھی نہیں تھی ۔ اس نے دیکھا کہ اس کی اسٹینو جو اس کے کمرے میں داخل ہوتے ہی مسکرانے لگتی تھی اور خود سپردگی کے عالم میں اس کی باہوں میں جھول جاتی تھی، روز نت نئے تحفے وصول کرتی تھی ۔ مگر جب کمرے سے باہر نکلتی تھی تو جیسے اسے بھول جاتی ۔ اس نے چھپ کر دیکھا تھا کہ وہ کمرے سے نکلتے ہی اپنا پہلا مکھوٹا اتار لیتی تھی ۔ اب اس کے چہرے پر اس کے لیے پیار کی کوئی علامت نظر نہ آتی ۔ وہ اسی کے آفس کے ایک نوجوان کلرک رمیش ملہوترا سے پیار کرتی تھی ۔ بعد میں اسے اس کا یقین بھی ہو گیا کیوں کہ جلد ہی دونوں نے شادی کر لی تھی ۔

جب وہ آفس میں داخل ہوتا تھا تو تمام کلرک ادب سے کھڑے ہو جاتے تھے مگر جب وہ اپنے کمرے میں چلا جاتا تھا تو سب اس طرح اطمینان کا سانس لیتے جیسے ایک بلا تھی جو ٹل گئی۔ ان کی آنکھوں میں اب اس کے لیے عزّت و احترام کے بجائے نفرت اور غصّہ ہوتا۔

جب وہ اپنے دوستوں سے ملنے جاتا، سبھی دوست اس سے نہایت عزّت سے پیش آتے، اس کی ہر بات پر گردن ہلاتے رہتے، اس کی معمولی سی بات پر بھی اتنا کھل کر ہنستے جیسے اس سے زیادہ پُر مذاق بات انھوں نے پہلے کبھی نہیں سُنی۔ اس کے عہدے اور قابلیت کی تعریف کرتے، اس کی سچائی، شرافت اور عظمت کے گُن گاتے۔ مگر وہ جیسے ہی ان کے درمیان سے اُٹھ کر چلا جاتا، سب اُس کی بُرائی شروع کر دیتے۔ اسے ڈائرکٹر کی جوتیاں چاٹنے والا اور ماتحتوں پر ظلم کرنے والا بتاتے، اسٹینو سے اس کے تعلقات پر فقرے کستے اور خوب قہقہے لگاتے۔ اُسے انتہائی چاپلوس، نکمّا اور سخت گیر گردانتے۔ اس پر رشوت خوری اور تعیش پسندی کے الزامات تراشتے۔ غرض اسے دنیا کا سب سے زیادہ ذلیل اور بُرا آدمی کہتے۔ وہ سب اس کے سامنے دوستی کے مکھوٹے پہن کر بیٹھتے تھے اور اس کے جاتے ہی وہ لوگ اپنے مکھوٹے تہ کر کے اپنی جیبوں میں ٹھونس لیتے تھے۔ اس کی بیوی جو اس کی محبت اور وفاداری کا دم بھرتی رہتی، اس کی کسی بات کی مخالفت نہ کرتی اور اس کے سامنے اس کی مردانہ خوب صورتی اور قابلیت کے گُن گاتی تھی، اس طرح ہر روز اپنی ایک نہ ایک فرمائش پوری کروانے کا موقع نکال لیتی۔ مگر اس نے معلوم کیا کہ اس کی بیوی بھی ابتدا ہی سے اُسے دھوکا دیتی آ رہی تھی۔ وہ اس کی تعریف کرتی اسے خوش کر کے اپنی نئی نئی فرمائش پوری کرنے پر آمادہ کرنے کے لیے اس کا میک اپ اور سنگار تو بہ ظاہر اسی کے لیے

ہوتا تھا، مگر وہ اُسے اپنے شوہر سے زیادہ عیش و آرام کا ایک محفوظ ذریعہ سمجھتی تھی۔ وہ اس کے اونچے عہدے اور لمبی تنخواہ سے مرعوب ہو کر اس کے سامنے وفاداری اور محبت کا مکھوٹا پہنے رہتی تھی، ورنہ وہ اسے رتی برابر بھی پیار نہیں کرتی تھی اور اسے اپنی بیوی کے اس کردار کا بھی بہ خوبی اندازہ ہو چکا تھا۔ اسے سب سے بڑا صدمہ اس وقت ہوا جب اس نے دیکھا کہ اس کی ماں بھی ممتا کا مکھوٹا پہن کر ہی اس سے پیار کرتی تھی وہ اسے اپنے بیٹے سے زیادہ ایک مغرور اور خود پسند شخص سمجھتی تھی۔ اس کے بچّے اس کے سامنے اس کی اطاعت گزاری کا دم بھرتے تھے مگر اس کے پیچھے سب کے سب اس کا مذاق اڑاتے رہتے اور اسے کنجوس، ضدّی اور نہ جانے کیا کیا بتلاتے۔

اُسے ان ساری باتوں کا علم فوراً نہیں ہوا تھا۔ بہت دنوں تک چُھپ چُھپ کر تحقیق کرنے کے بعد اسے یہ معلوم ہوا تھا کہ اس کے اِرد گرد رہنے والے تمام لوگ اسی کی طرح مختلف مکھوٹے استعمال کرتے ہیں اور جس بات کو وہ اپنا بہت بڑا کارنامہ سمجھتا آیا تھا وہ دوسروں کے لیے روزمرہ کی بات ہے۔ اپنی فریب کاری کے جال کو اتنا بے معنی اور غیر اہم جان کر بڑا دُکھ ہوا اُسے، مگر اب وہ کیا کر سکتا تھا۔ وہ اتنے عرصے سے مکھوٹے استعمال کرتا آیا تھا کہ اب وہ مکھوٹے ہی اس کی فطرت بن گئے تھے اب وہ ان مکھوٹوں کے بغیر کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اُس نے محسوس کیا کہ وہ دنیا کا سب سے دکھی انسان ہے۔ دُکھی اور تنہا۔ اس کا یہاں کوئی نہیں جسے وہ اپنا کہہ سکے یا جس کے سامنے وہ کسی قسم کا مکھوٹا پہنے بغیر اپنے آپ کو پیش کر سکے۔ مکھوٹے کے بغیر اب اسے شاید کوئی پہچانے گا بھی نہیں۔ وہ خود بھی شاید اپنے آپ کو نہ پہچان سکے۔ بعض دفعہ وہ اپنی بے چارگی پر تڑپ اٹھتا۔ اُداسی اور تنہائی اسے چاروں طرف سے گھیر لیتی مگر وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اپنے مکھوٹے اُتار لینا

اس کے لیے آسان تھا مگر اتنے سارے لوگوں کے مکھوٹے وہ کیوں کر نوچ سکتا ہے؟
وہ اپنی زندگی اسی طرح گزار رہا ہے۔ تمام خوشیوں کے حصول کے بعد بھی اداس،
لوگوں کے درمیان رہتے ہوئے بھی تنہا۔ وہ مکھوٹے اب بھی استعمال کرتا ہے
مگر اب اس کے لیے ان میں کوئی دل کشی نہیں رہ گئی ہے۔

●

سنہ ۱۹۷۱ء

حمام

میں نے گھر سے باہر قدم رکھا ــــ میرے پانو بغیر کسی ارادے کے ایک طرف کو اُٹھ گئے ۔ دونوں طرف فٹ پاتھیں اور سامنے پھیلی ہوئی سڑک بالکل ننگی تھی ۔ ان کے ننگے بدن چمکیلی دھوپ میں تمتمارہے تھے ۔ دورویہ عمارتیں دھوپ میں کھڑی اونگھ رہی تھیں ۔ اکثر عمارتوں کی کھڑکیاں بند تھیں اور جو کھُلی تھیں اُن پر پردے جھول رہے تھے ۔ فٹ پاتھ کے کنارے بوڑھا نیم کا پیڑ بالکل شانت بھاؤ سے کھڑا تھا ۔ اس کا ایک ایک پتا منتر مگدھ تھا ۔ اس کی جڑوں میں سوکھے پتّوں اور پکی نبولیوں کی چادر سی بچھی تھی ۔ اس چادر پر ایک مریل سا کتا اپنی اگلی ٹانگوں میں گردن ڈالے سو رہا تھا ۔ قریب ہی دو کوّے آپس میں چونچیں لڑا رہے تھے ۔ شاید ایک کوّا اور دوسری کوّی تھی یا پھر ہو سکتا ہے دونوں ہی کوّے رہے ہوں ۔ اتنے میں ایک کار یہاں سے وہاں تک

پھیلی ہوئی سڑک پر زن سے نکل گئی۔ ہوا کا ایک تیز جھونکا پھڑ پھڑاتا ہوا میرے قریب سے گزر گیا۔ دونوں کوّے اُڑ کر درخت کی شاخ پر جا بیٹھے۔ خشک پتوں کی چادر بکھر سی گئی اور وہ مریل کتّا چونک کر اُٹھ بیٹھا۔ اپنے کان پھٹ پھٹائے اِدھر اُدھر دیکھا اور پہلے ہی کی طرح اگلے پیروں میں گردن ڈال کر سو گیا۔

سامنے فٹ پاتھ سے ایک شخص آرہا تھا۔ میری نظریں اُس پر جم گئیں۔ وہ جوں جوں قریب آتا جا رہا تھا، میری آنکھیں حیرت اور استعجاب سے پھیلتی جا رہی تھیں۔ میں اب اسے اچھی طرح دیکھ سکتا تھا وہ ایک مضبوط اور توانا شخص تھا۔ اس کے سر پر جمے ہوئے بال دھوپ میں چمک رہے تھے۔ شیو بنا ہوا تھا۔ کلائی پر گھڑی بندھی ہوئی تھی۔ پیروں میں چمچاتے بوٹ تھے۔ بوٹوں کی کھٹ کھٹ سے دوپہر کا سنّاٹا کراہ رہا تھا۔ مگر اس شخص کے بدن پر کپڑوں کے نام پر ایک تار بھی نہیں تھا۔ وہ بالکل ننگا تھا۔ جوں ہی اس کی نظر مجھ پر پڑی وہ ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ وہ میرے سامنے والی فٹ پاتھ پر تھا۔ میں بھی چلتے چلتے رک گیا۔ میری نظریں اس کے ننگے بدن پر جمی ہوئی تھیں میں نے محسوس کیا کہ وہ مجھے عجیب نظروں سے گھور رہا ہے۔ وہ تھوڑی دیر تک مجھے اسی طرح گھورتا رہا۔ پھر بوٹ کھٹ کھٹاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ اس نے دوبارہ پلٹ کر میری طرف نہیں دیکھا۔ میں اس کے ننگے بدن کو دھوپ میں چمکتا دیکھتا رہا۔ میں پھر آگے بڑھا۔ میرے سر پر بے انتہا گرم سورج چمک رہا تھا اور پیروں تلے جلتی ہوئی فٹ پاتھ تھی۔

میں چلتا رہا۔ اب میں ایک گلی کے نکڑ پر پہنچ چکا تھا۔ سامنے دو لڑکیاں سڑک کراس کرتی ہوئی میری طرف بڑھ رہی تھیں۔ دونوں خوش شکل اور

جوان تھیں ۔چہرے میک اَپ سے پُتے ہوئے تھے ۔ دونوں میں ایک جو قد میں دوسری سے نکلتی ہوئی سی تھی ۔ ہاتھ ہلا ہلا کر دوسری سے کچھ کہہ رہی تھی اور دوسری کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ راج ہنس کے پروں کی طرح پھیلی ہوئی تھی ۔ مگر دونوں ایک دم ننگی تھیں ۔ ان کے سڈول اور چکنے بدن دھوپ میں کندن کی طرح دمک رہے تھے ۔ جوان چھاتیوں کا زیر و بم قیامت ڈھا رہا تھا اور پتلی کمر موجوں پر تیرتے ہوئے شکارے کی طرح ہلکورے لے رہی تھی ۔ میرے بدن کا خون تیزی سے گردش کرنے لگا ۔ کنپٹیاں گرم ہو گئیں اور رگیں ستار کے کسی تار کی طرح تن گئیں ۔ وہ میرے بالکل قریب آ گئی تھیں ۔ ان دونوں کی نظریں ایک ساتھ مجھ پر پڑیں اور دوسرے ہی لمحے فضا میں دو چیخیں بلند ہوئیں ۔ میں بوکھلا گیا ۔ وہ دونوں تیورا کر پلٹیں اور چیختی چلاتیں بے تحاشہ سامنے والی گلی میں گھستی چلی گئیں ۔ میں اب بھی سٹپٹایا سا اپنی جگہ کھڑا تھا ۔ اتنے میں قریب کی عمارتوں سے چار پانچ افراد "کیا ہوا ؟ کیا ہوا ؟" کہتے ہوئے نکلے ۔ لڑکیاں میری طرف اشارہ کرنے لگیں ۔ مگر ان کے پیر رُکے نہیں ۔ وہ اب بھی بھاگی جا رہی تھیں ۔ وہ چاروں پانچوں آدمی میری طرف لپکے اور میں مارے گھبراہٹ کے پلٹ کر اپنے داہنے ہاتھ کی گلی میں گھس گیا ۔ میں نے مڑ کر دیکھا وہ لوگ میرے پیچھے دوڑے چلے آ رہے تھے اور سب کے سب ننگے تھے ۔ میں بے تحاشہ بھاگ رہا تھا ۔۔۔ ایک گلی سے دوسری گلی میں ، میرے پانو میرے جسم کے بھاری بوجھ کو اُٹھائے گویا ہوا میں اُڑے جا رہے تھے ۔ اب وہ لوگ میری نظروں سے اوجھل ہو گئے تھے ۔ میں ایک الیکٹرک پول سے ٹک کر زور زور سے سانس لینے لگا ۔ میری آنکھیں مندی ہوئی تھیں اور میں زبان باہر نکالے کسی جانور کی کی طرح ہانپ رہا تھا ۔ جب ذرا سانس درست ہوئی تو میں نے آنکھیں کھولیں ۔

پیشانی سے پسینہ پونچھا۔ میں ایک تراہے پر کھڑا تھا۔ جہاں تین چھوٹی چھوٹی گلیاں مختلف سمتوں سے آکر مل گئی تھیں۔

اتنے میں میرے بائیں طرف والی گلی سے ایک عورت چار پانچ سالہ بچّے کے ساتھ نظر آئی۔ مگر اب مجھے اس بات پر حیرت نہیں تھی کہ وہ عورت بالکل ننگی تھی بل کہ تعجب اس بات پر تھا کہ اس کے ساتھ والے بچّے کا بدن کپڑوں سے ڈھکا ہوا تھا اور وہ اس ننگی عورت کی انگلی تھامے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا میں جلدی سے ایک دیوار کی اوٹ میں ہو گیا کہ کہیں یہ عورت بھی ان لڑکیوں کی طرح چیخنا چلاّنا نہ شروع کر دے۔ وہ عورت بائیں طرف والی گلی سے نکل کر دائیں طرف والی گلی میں داخل ہو گئی۔ میں آگے بڑھا۔ ابھی چند قدم بھی نہ چلا تھا کہ ایک نوجوان جوڑا ہاتھ میں ہاتھ ڈالے آتا دکھائی دیا۔ وہ دونوں بھی ننگے تھے اور اس طرح بے تکلفی سے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے چلے آرہے تھے۔ جیسے یہ ننگا پن ان کا معمول رہا ہو۔ وہ دونوں میرے بالکل قریب آگئے تھے۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی لڑکی نے ہلکی سی چیخ کے ساتھ اپنے ساتھی کا بازو تھام لیا اور وہ نوجوان اس کی عریاں کمر کے گرد اپنی بانہہ کو کستے ہوئے خشمگیں نظروں سے مجھے گھورنے لگا۔ میں چپ چاپ کھڑا رہا۔ میں نے بھاگنے کی کوشش نہیں کی۔ نوجوان کچھ دیر تک مجھے کھڑا گھورتا رہا، پھر میرے منہ پر تھوک کر اس لڑکی کی کمر میں ہاتھ ڈالے آگے بڑھ گیا اور میں اپنی ہتھیلی سے چہرے پر پڑا تھوک پونچھنے لگا۔

وہ نوجوان جوڑا آنکھوں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ میں گردن جھکائے چپ چاپ ایک طرف کو چلنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد ٹن ٹن۔ ٹن گھنٹی کی آواز آئی۔ میں نے گردن اٹھا کر دیکھا۔ سامنے ایک مدرسہ تھا۔ ننھے ننھے بچے غول در غول باہر نکل رہے تھے۔ مدرسے کے سامنے اسکول بسیں کھڑی تھیں۔ بچّے قطاریں

باندھ باندھ کر بسوں پر چڑھنے لگے۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑا اطمینان ہوا کہ ان ننھّے منّے بچوّں کے جسم یونی فارم میں چھپے ہوئے تھے۔ مگر میرا اطمینان دوسرے ہی لمحے پانی کے بُلبُلے کی طرح ٹوٹ گیا۔ مدرسے کے دروازے سے تین لیڈیز ٹیچرز برآمد ہو رہی تھیں، اُن کے پیچھے اسکول کے فادر بھی تھے اور وہ سب مادر زاد ننگے تھے۔ میں گھبرا کر وہاں سے آگے بڑھ گیا۔

میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ ماجرا کیا ہے؟ آخر اس شہر میں اچانک سب ننگے کیوں ہو گئے ہیں کیا ملک کی ساری ٹیکسٹائل ملیں بند ہو گئی ہیں؟ یا کسی بہت بڑے جادوگر نے اچانک، شہر کے سارے کپڑے غائب کر دیے ہیں۔ مجھے لگا میرا ذہن رفتہ رفتہ منجمد ہوتا جا رہا ہے۔ اب میں بڑی سڑک پر آ گیا۔ سڑک پر بے شمار رکشائیں، بسیں اور کاریں بھاگ رہی تھیں۔ شور و غل سڑک کی چھاتی سے جھرنے کی طرح ابل رہا تھا۔ دونوں طرف فٹ پاتھوں پر لوگ چل رہے تھے۔ مگر یہ کیا ہوا؟ یہاں بھی سب ننگ دھڑنگ گھوم رہے تھے۔ فٹ پاتھ پر، سڑک پر، ہوٹلوں میں، بسوں میں، موٹر کاروں میں، سائیکلوں پر، دکانوں میں، ہر جگہ لوگ ننگے تھے۔ میں حیرت سے آنکھیں پھاڑے ایک ایک کو دیکھ رہا تھا اور لوگ استعجاب آمیز نظروں سے مجھے گھور رہے تھے۔ جیسے میرا وجود ان سب کے لیے ایک عجوبہ ہو۔ بعض تو بہت دور تک مجھے گھورتے رہتے۔ میں بس اسٹاپ کے پاس سے گزرا۔ کیو میں عورتیں، مرد، بوڑھے، جوان سب ہی ننگے تھے اور ایک دوسرے سے اس طرح چپکے کھڑے تھے کہ دیکھ کر مجھے گھن آنے لگی۔ میں جلدی سے آگے بڑھ گیا۔ کیو میں کھڑے لوگ گردنیں اُٹھا اُٹھا کر مجھے دیکھنے لگے تھے۔ بائیں طرف سنت گیانیشور کا مندر تھا۔ مندر کا گھنٹہ زور زور سے بج رہا تھا۔ بہت سے مرد اور عورتیں بھگوان کی مورتی

کے سامنے ہاتھ جوڑے آنکھیں موندے کھڑے تھے۔ مگر کسی کے بدن پر معمولی سا کپڑا تک نہیں تھا۔ حتّٰی کہ پنڈت جی بھی جو زور زور سے شلوک پڑھ رہے تھے اور گھنٹہ بجا رہے تھے برہنہ تھے۔ دائیں طرف ایک مسجد تھی۔ غالباً عصر کی نماز کے لیے لوگ قطاریں باندھے کھڑے تھے۔ فٹ پاتھ سے مسجد کے اندر کا منظر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ نمازی ایک ساتھ رکوع و سجود میں مصروف تھے مگر ان کے جسم مادر زاد ننگے تھے۔ بڑا ہی مضحکہ خیز بلکہ گھناؤنا منظر تھا۔ میں نے اپنا منہ پھیر لیا اور جلدی سے آگے بڑھ گیا۔

ابھی میں مشکل سے دس قدم چلا ہوں گا کہ دو ڈیوٹی کانسٹبل منکر نکیر کی طرح میرے دائیں بائیں نمودار ہوئے۔ ایک نے بڑھ کر میرے دونوں ہاتھ تھام لیے اور دوسرے نے جھٹ میرے ہاتھوں میں ہتکڑیاں ڈال دیں۔ میں سوالیہ نظروں سے انھیں دیکھنے لگا۔

"ہم بہت دور سے تمھارا پیچھا کر رہے ہیں کیا تم نہیں جانتے کہ اس طرح سڑکوں پر ننگا گھومنا پھرنا قانون کی نظر میں جرم ہے؟"

میں نے حیرت سے اپنے ارد گرد نظر ڈالی۔ میرے چاروں طرف لوگوں کی ایک زبردست بھیڑ تھی اور سب کے سب برہنہ تھے۔ یہاں تک کہ میرے ہاتھوں میں ہتکڑیاں ڈالنے والے کانسٹبل بھی ننگے تھے۔ میں نے ہجوم کی طرف دیکھا تمام لوگ مجھے نفرت اور غصّے کی نظروں سے گھور رہے تھے۔ میں نے اپنے ہاتھوں میں پڑی ہتھکڑیوں پر ایک نظر ڈالی اور ان ڈیوٹی کانسٹبلوں کے ساتھ ہولیا۔ میرے پیچھے ننگے لوگوں کا ایک جم غفیر چلا آرہا تھا۔

کالے ناگ کے پجاری

"شہر کے سارے پھاٹک بند ہو چکے تھے اور فصیلوں پر سیاہ پوش سپاہی پہرہ دے رہے تھے۔ ان کے لمبے لمبے نیزوں کی انیاں آسمان کی جانب اٹھی ہوئی تھیں۔ بعض سپاہی اپنے چلّوں پر تیر چڑھائے چوکس نگاہوں سے گرد و پیش کا جائزہ لے رہے تھے۔ اگر انھیں ایک متنفس بھی فصیل کی طرف یا دروازے کی سمت بھاگتا دکھائی دیتا تو فوراً دو چار تیر ایک تیز سنسناہٹ کے ساتھ چلّوں سے نکلتے اور مفرور شخص کے جسم میں پیوست ہو جاتے۔ اگر کوئی سخت جان ان تیروں کی زد سے بچ جاتا تو شہر کے پھاٹکوں پر کھڑے سپاہی اپنے بڑے بڑے جال اُس پر پھینکتے اور اُسے فوراً گرفتار کر کے ایک مخصوص قسم کے بورے میں بند کر دیتے اور وہ سر بہ مہر بورا کسی نامعلوم مقام کی طرف روانہ کر دیا جاتا۔ شہر کی سڑکیں صبح سے شام تک سیاہ پوش سپاہیوں کے بوٹوں کی کھٹ کھٹ سے گونجتی رہتیں اور عجیب پُراسرار قسم کی پھنکاریں فضا میں سرسراتی رہتیں۔ جیسے ہوائیں

کسی اندرونی کرب سے سسکیاں بھرتی گزر رہی ہوں۔ ایک عجیب ماتمی کیفیت شہر کے طول و عرض پر مسلّط تھی۔ فرار کے سارے راستے مسدود تھے۔"

داستان گو بوڑھا ایک لمحے کو رُکا۔ ٹرین اپنی پوری رفتار سے آگے بڑھ رہی تھی۔ ڈبے میں صرف چھ سات مسافر باقی رہ گئے تھے اور بوڑھا داستان گو اپنے پُراسرار وجود کی بنا پر اساطیری کہانیوں کا کردار لگ رہا تھا۔ مسافروں کی خوف اور حیرت سے پھیلی ہوئی آنکھیں بوڑھے کے جھرّیوں دار چہرے پر گڑی تھیں۔ بوڑھا چند لمحوں تک اسی طرح خاموشی سے کھڑکی کے باہر اندھیرے میں گھورتا رہا۔ پھر کھنکار کر بولا۔

"شہر میں صرف دو قسم کے لوگ رہتے تھے۔ ایک وہ جو کالے ناگ کے پجاری تھے اور دوسرے وہ جو صرف کالے ناگ کے لیے چارے کے طور پر استعمال ہوتے تھے کالے ناگ کے پجاری مضبوط آہنی دیواروں کے پیچھے بڑی محفوظ اور پُرسکون زندگی گزار رہے تھے۔ جب کہ باہر لوگوں کی زندگی عذاب بنی ہوئی تھی۔

سڑکیں، فٹ پاتھ اور گلیاں ہر جگہ سڑے گلے انسانی جسموں کے ڈھیر پڑے ہوئے تھے، جو محض اس لیے زندہ معلوم ہوتے تھے کہ ابھی ان کی سانسیں چل رہی تھیں۔ لوگ ہر وقت جنازے اور ارتھیاں اُٹھائے جلوس کی شکل میں سڑکوں پر سے گزرتے نظر آتے۔ جھکی ہوئی گردنیں اور لٹکے ہوئے چہرے لیے لوگ دھیرے دھیرے اس طرح قدم اُٹھاتے جیسے انھیں موت کی سزا سُنا دی گئی ہو۔ یہ سلسلہ شب و روز جاری رہتا۔ شہر کی ساری سڑکیں قبرستانوں اور شمشان گھاٹوں کے دروازوں پر جا کر ختم ہو جاتی تھیں۔ جن کے پھاٹکوں پر جلی حروف میں "خوش آمدید" لکھا ہوتا تھا۔

بازاروں اور دکانوں میں کٹے پھٹے انسانی اعضا سجائے جاتے تھے۔ قہوہ خانوں میں خون سے لبریز پیالیاں کھنکتی رہتیں۔ دوائی اور انجکشنوں کی ہر شیشی پر سرخ حروف

میں لکھا ہوتا 'موت'۔

سب کچھ اس طرح اُلٹ پلٹ گیا تھا کہ لوگ ہمیشہ یہ محسوس کرتے رہتے جیسے وہ سڑکوں پر سر کے بل چل رہے ہوں۔ لوگ جب زندگی کے عذاب کو جھیلتے جھیلتے تھک جاتے تو سکون کی خاطر ایسی عبادت گاہوں میں پناہ لیتے جہاں سارے اصول کھنڈر بن چکے تھے اور محرابوں پر مکڑیوں نے جالے تان دیے تھے۔ قریب قریب بھی انسانوں کے مُنہ پر سیاہ پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ اگر دو چار لوگ کوشش کرکے آپس میں بولتے بھی تو اُن کی گفتگو کچھ اس قسم کی ہوتی۔

لفظوں کے ملبے میں معنی تلاش کرنا فضول ہے۔
بے معنویت کا زہر زندگی کی رگ رگ میں پھیل چکا ہے۔
ساری قدریں سر کے بل کھڑی ہیں۔
انسان نے ہمیشہ نفرت بوئی ہے، نفرت ہی کاٹے گا۔ وغیرہ"

داستان گو بوڑھا ایک بیک خاموش ہوگیا۔

ڈبے میں بیٹھے ہوئے لوگ اپنی ہی خاموشی کے بوجھ تلے دبے، بوڑھے کی طرف متجسّسانہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ جب تھوڑی دیر تک بوڑھا کچھ نہ بولا تو ایک شخص نے بھرائی آواز میں پوچھا۔

"بابا! کیا یہ سب آپ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا؟"

بوڑھے نے دھیرے دھیرے گردن اُٹھائی۔ چند لمحوں تک اُس شخص کو خالی خالی نظروں سے گھورتا رہا پھر بولا ——— "ہاں میں نے سب کچھ اپنی نظروں سے دیکھا تھا۔"

بوڑھا کھڑکی سے باہر اندھیرے میں نظریں گڑائے اپنے آپ میں بڑبڑا رہا تھا۔ "آج بھی وہ سارے مناظر میری نظروں کے سامنے گھوم جاتے ہیں۔ میں دیکھ رہا

ہوں کہ ٹرین کی پٹری یہاں سے وہاں تک بے شمار انسانوں کو لِٹا دیا گیا ہے۔ اُن کے ہاتھ پشت پر بندھے ہیں۔ آنکھوں پر پٹیاں کسی ہوئی ہیں۔ اتنے میں سیاہ رنگ کی ایک ٹرین جس کے انجن پر کالے رنگ کی تصویر بنی ہے، دندناتی ہوئی آتی ہے اور انسانی جسموں پر سے اس طرح گزر جاتی ہے کہ تمام انسان دو حصّوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں اور پھر یہ ہوتا ہے کہ ان کٹے پھٹے اعضا سے خون کے فوّارے پھوٹ پڑتے ہیں اور خون کے ایک ایک قطرے سے ایک نیا آدمی جنم لیتا ہے۔ انتہائی لاغر اور مرا مرا سا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک طرف سے دیو پیکر ٹرک گھڑ گھڑاتے آدھمکتے ہیں جن میں ویسے ہی سیاہ پوش سپاہی تیر کمان اور تھیلے لیے بیٹھے ہیں جیسے قلعہ کی فصیل پر پہرہ دینے والے تھے۔ پھر وہ لوگ ٹرک میں بیٹھے بیٹھے ہی ایک عجیب و غریب چھڑی نکالتے ہیں جو مچھلی پکڑنے کی بنسی سے ملتی جلتی ہے۔ اُس کے ایک سرے پر ایک دھاگا لٹک رہا ہے، جس میں ایک پُرزہ پھنسا ہوا ہے۔ پُرزے پر لکھا ہے "ضرورت ہے۔" پُرزے کی تحریر اندھیرے میں روشنی کی طرح چمکتی ہے۔ لوگ اُس تحریر کو پڑھتے ہی پُرزے کی طرف لپکتے ہیں اور جو بھی اُس پُرزے کو چھوتا ہے اُسی سے چپک جاتا ہے۔ پھر سیاہ پوش سپاہی انھیں پکڑ کر اپنے مخصوص قسم کے تھیلوں میں بند کر دیتے ہیں اور تھیلا ٹرک میں ایک طرف کو لڑھکا دیتے ہیں۔ جب ٹرک بھر جاتا ہے تو ڈرائیور اُسے ایک دم سے اسٹارٹ کر کے لوگوں کی بھیڑ کو روندتا کچلتا آگے بڑھ جاتا ہے۔ کرب ناک چیخوں سے چاروں دِشائیں کانپنے لگتی ہیں۔"

بوڑھا یکبارگی چُپ ہو گیا۔ پر لوگوں سے زیادہ دیر تک چُپ نہیں رہا گیا۔ ایک شخص نے بے حد مضطربانہ انداز میں پوچھا۔

"وہ ٹرک کس کے ہوتے تھے؟"

بوڑھے کی سفید گھنی پلکیں آہستہ آہستہ اوپر کو اُٹھیں اور اس کے ہونٹ ہلے۔

"اُن ٹرکوں پر انسانی کھوپڑی کا نشان بنا ہوتا تھا اور کھوپڑی کے اوپر کالا ناگ کنڈلی مارے بیٹھا رہتا۔"

"ان مریل آدمیوں کو کہاں لے جایا جاتا تھا؟"

"انھیں آہنی دیواروں کے اُس پار لے جایا جاتا جہاں کالے ناگ کے پجاریوں کا مسکن تھا۔ کالے ناگ کے پجاری مہر بند تھیلیوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوتے، اور ٹرک والوں کو اُن کی خدمات کے عوض قیمتی تحائف پیش کرتے۔ تحائف لے کر ٹرک والے تو لوٹ جاتے، پھر کالے ناگ کے پجاریوں کے اشارے پر مہر بند تھیلے کھولے جاتے جن میں سے وہی مریل آدمی برآمد ہوتے۔ جنھیں دیکھ کر کالے ناگ کے پجاری کافی محظوظ ہوتے۔ پھر ان کے اشاروں پر ایک ایک آدمی کو سامنے ایک بڑے سے پنجرے میں دھکیل دیا جاتا۔ جس میں ایک قوی الجثہ کالا ناگ پھنکارتا رہتا۔ جوں ہی مریل آدمی کو پنجرے میں پھینکا جاتا۔ کالا ناگ اُس آدمی پر ٹوٹ پڑتا اور دل دوز چیخوں سے فضا تھرانے لگتی اور کالے ناگ کے پجاری اپنی موٹی توندوں پر ہاتھ پھیرتے بڑے پرسکون انداز میں گردنیں ہلاتے رہتے۔ گویا جو کچھ ہو رہا ہے اُن کی توقع کے عین مطابق تھا۔

کالے ناگ کی پھنکاریں تیز سے تیز تر ہوتی جاتیں اور وہ اچھل اچھل کر اُس مریل آدمی کی طرف لپکتا اور اپنی تیز زہریلی زبان سے اُس کے جسم کے کسی نہ کسی حصے کو چاٹ کر پلٹ جاتا۔ رفتہ رفتہ مریل آدمی کی چیخیں مدھم پڑتی جاتیں۔ اُس کا مچلنا تڑپنا بھی بند ہو جاتا اور اس کے ہونٹوں سے صرف کراہیں نکلتی رہتیں۔ کالا ناگ اُس کے جسم سے برابر خون چوسے جاتا۔ پھر اس کی رفتار بھی سست پڑتی جاتی۔ غالباً اس کا پیٹ بھر چکا ہوتا ــــ پھر یوں ہوتا کہ کالا ناگ کنڈلی مار کر ایک طرف بیٹھ جاتا۔ اُس کی آنکھیں شکم سیری کے خمار سے مُندتی جاتیں۔ دوسری طرف اُس کا شکار اب صرف

گہری گہری سانسیں لیتا رہتا۔ پھر کالے ناگ کے پجاری اپنے غلاموں کو اشارہ کرتے۔ غلام مریل آدمی کے نیم مردہ جسم کو گھسیٹ کر پنجرے کے باہر نکالتے اور سڑک پر پھینک آتے، جہاں وہ اپنے ہی جیسے ہزاروں لاکھوں لوگوں کی بھیڑ میں شامل ہو جاتا ––

اس کھیل کے بعد کالے ناگ کے پجاریوں کے چربیلے چہرے اذیت کوشی کی مسرّت سے تمتمانے لگتے۔ اُن کی آنکھیں اُس شریر بچے کی آنکھوں کی طرح چمکنے لگتیں، جس نے ابھی ابھی اپنی غلیل سے کسی ننھی سی فاختہ کو نشانہ بنایا ہو۔"

اتنا کہہ کر بوڑھا پھر خاموش ہو گیا۔ اُس کا چہرہ کسی پتّھر کی سِل کی طرح سخت اور سپاٹ تھا۔ ڈبے میں بیٹھے ہوئے لوگوں کی آنکھوں کا خوف کچھ اور گہرا ہو گیا۔ ایک شخص نے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"بابا! کیا اُس شہر میں کوئی قانون نہیں تھا؟"

"قانون!" بوڑھا دھیرے سے بولا۔ "قانون ہمیشہ زبردست کی لاٹھی کی طرح ہوتا ہے۔ جس سے طاقت ور اپنے سے کم زور لوگوں کو بھیڑ بکری کی طرح ہانکتا رہتا ہے۔ اُس شہر میں بھی صرف کالے ناگ کے پجاریوں کا قانون چلتا تھا۔ جس کی حفاظت سیاہ پوش سپاہی کرتے تھے۔"

"تو کیا وہ کروڑوں لوگ، سڑکوں اور فٹ پاتھوں پر اسی طرح سِسک سِسک کر مرتے رہے؟"

"ہاں –––– موت اُن کا مقدّر بن چکی تھی اور زندگی اُن کے لیے عذاب سے کم نہیں تھی۔ کبھی کبھی وہ مریل اور لاغر ہڈیوں کے ڈھانچے غول در غول کالے ناگ کے پجاریوں کے مسکن پر دھاوا بول دیتے تھے۔ مگر آہنی دیواروں کے گرد تعینات سیاہ پوش محافظ انھیں تیروں اور برچھیوں پر رکھ لیتے اور خندقوں کو لاشوں سے پاٹ دیتے۔ پھر ایک عرصے تک کوئی ان آہنی دیواروں کا رُخ نہ کرتا۔"

بوڑھے نے خاموش ہوکر اپنے گرد بیٹھے ہوئے لوگوں پر نظر ڈالی۔ نیم اُجالے نیم اندھیرے میں سبھوں کے چہرے خوف و دہشت سے زرد پڑ گئے تھے۔ بوڑھا تھوڑی دیر تک غور سے ایک ایک کے چہرے کو دیکھتا رہا۔ پھر دھیرے سے بولا۔

"مگر کالے ناگ کے پجاریوں کا کاروبار زیادہ عرصے تک نہیں چل سکا اور ایک دن وہ خود بھی کالے ناگ کا شکار ہو گئے۔"

"کیا۔!" ڈبے میں بیٹھے تقریباً سبھی لوگ مسرّت سے چیخ پڑے۔ "کالے ناگ کے پجاری مارے گئے؟"

"ہاں۔" بوڑھے داستان گو کی پُراسرار بھاری آواز کسی اندھے کنویں کی بازگشت کی طرح سُنائی دی۔ "کالا ناگ شہر کے سارے لوگوں کا خون پی چکا تھا اور اس کی پیاس روز بہ روز بڑھتی جا رہی تھی۔ پھر یہ ہوا کہ ایک دن سیاہ پوش سپاہی کالے ناگ کے لیے تازہ دم شکار مہیّا نہ کر سکے۔ تب کالے ناگ نے اپنی شیطانی پیاس سے پریشان ہو کر اپنے پجاریوں پر حملہ کر دیا اور اپنے تیز زہریلے دانت ان کی گردنوں میں گاڑ دیے۔ پجاری ہاتھ پیر پٹکتے رہے اور کالا ناگ اُن کا خون پیتا رہا۔ پھر ایک عجیب بات یہ ہوئی کہ پجاریوں کی موت کے بعد کالا ناگ بھی آہنی دیواروں سے اپنا سر پٹک پٹک کر ختم ہو گیا اس طرح اُس شہر کے کروڑوں لوگوں کو اس بھیانک کھیل سے نجات مِل گئی۔"

بوڑھا اتنا کہہ پایا تھا کہ ٹرین کی تیز وِھسل سنائی دی اور سنّاٹے کا کلیجا دُور تک چھِدتا چلا گیا۔ گاڑی کسی اسٹیشن پر رُک رہی تھی۔ بوڑھا چونک کر کھڑا ہو گیا۔

"اوہو! مجھے اسی اسٹیشن پر اُترنا ہے۔" اُس نے جلدی سے اپنا میلا جھولا بغل میں دبایا اور ڈبّے میں بیٹھے ہوئے لوگوں سے رخصت ہو کر پلیٹ فارم پر اُتر گیا۔ مسافروں کے چہروں پر دوبارہ مسرّت اور اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔ وہ لوگ بوڑھے کی داستان پر آپس میں تبادلہ خیال کرنے لگے۔

میں چپکے سے اُٹھا اور اُس بوڑھے کے پیچھے ہی گاڑی سے نیچے اُتر گیا۔
باہر چاروں طرف سنّاٹا تھا۔ اسٹیشن کی عمارت اور پلیٹ فارم، یہاں سے وہاں تک اندھیرے میں ڈوبے ہوئے تھے۔ بوڑھا سر جھکائے ایک طرف کو چلا جارہا تھا میں نے جھجکتے ہوئے بوڑھے کو آواز دی۔ "بابا!"
بوڑھا ٹھٹکا، ٹھٹک کر مڑا۔ میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا اُس کے قریب پہنچ کر رُک گیا۔ پھر اس کی چبھتی نگاہوں سے بچنے کے لیے اُس کے میلے جھولے پر نظریں گڑائے پوچھا۔ "دراصل بات یہ ہے بابا! کیا کالے ناگ کے پجاری سچ مچ مارے گئے۔؟"
بوڑھے نے چونک کر گردن اُٹھائی۔ چند لمحوں تک مجھے گھورتا رہا۔ پھر تھوڑے سے توقف کے بعد دھیرے سے پوچھا۔
"تمھارا کیا خیال ہے؟"
"مجھے آپ کے آخری بیان پر شبہہ ہے!"
اچانک بوڑھے کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ اُس کی آنکھوں سے بے پناہ کرب جھلکنے لگا۔ اُس نے انتہائی مایوس کن لہجے میں جواب دیا۔
"تمھارا شبہہ درست ہے۔ میں نے محض ڈبّے میں بیٹھے لوگوں کا خوف دور کرنے کی غرض سے جھوٹ بولا تھا۔ ورنہ حقیقتاً کالے ناگ کے پجاری آج بھی زندہ ہیں اور اُن کا وہ خونی کاروبار بھی اسی طرح جاری ہے۔"
اتنا کہہ کر وہ بوڑھا مڑا اور دھیرے دھیرے قدم اُٹھاتا ایک طرف کو چلنے لگا۔ میں اندھیرے میں مدغم ہوتی اُس کی پُراسرار شبیہہ کو گھورتا رہا۔
میں نے غور کیا ــــ فضاؤں میں پُراسرار قسم کی پھنکاریں اب بھی سرسرا رہی تھیں۔

●

اُس کا بُت

اُس نے ایک بُت بنایا۔ اُسے ایک عالی شان مندر میں نصب کر کے روزانہ اس کی پوجا کرنے لگا۔ ہر چند کہ بتوں کی پوجا اس کا مسلک نہیں تھا مگر اس بُت کی زیارت سے اس کے اندر زندگی جینے کا حوصلہ پیدا ہوتا تھا اور وہ طوفانوں کے رُخ موڑ دینے کا عزم لے کر زندگی کے سمندر میں کود پڑتا۔

بجلی کڑکی۔ روشنی کا ایک جھماکا سا ہوا۔ جیسے ہزاروں بلب جل کر بجھ گئے ہوں۔ اس تیز روشنی میں اسے مندر کی طرف جانے والی پگ ڈنڈی دکھائی دی اور وہ دوبارہ پوری قوت سے دوڑنے لگا۔ وہ بُری طرح ہانپ رہا تھا۔ کپڑے بھیگ کر وزنی ہو گئے تھے۔ پتلون کے گیلے پائینچے پیروں سے اس طرح لپٹ لپٹ جاتے کہ اسے چار قدم کے بعد رُک کر انھیں درست کرنا پڑتا۔ جنگل کی کچی سڑک پر جگہ جگہ گڈھے بن گئے تھے۔ جن میں برسات کا پانی جمع ہو گیا تھا۔ اس کے پیر بار بار ان گڈھوں میں پڑ جاتے۔

اور وہ کئی دفعہ منہ کے بل گرتے گرتے بچا۔ اس کا سانس بُری طرح پھولنے لگا تھا۔ مگر وہ برابر دوڑتا رہا۔ وہ جانتا تھا کہ اس طوفانی برسات میں جب کہ بڑے بڑے درختوں نے گھٹنے ٹیک دیے ہیں اور جہاں دوُر دوُر تک آسمان کے نیچے کوئی چھت سلامت نہیں۔ اسے صرف اسی مندر میں پناہ مل سکتی ہے جہاں وہ عظیم بُت نصب تھا۔ اس کے جوتے کب کے پھٹ کر راستے کے کیچڑ میں کہیں پھنس پھنس گئے تھے۔ پتا نہیں راستے میں کتنی ٹھوکریں لگیں۔ کتنے کانٹے تلووں میں دھنس کر ٹوٹ گئے۔ پیروں میں سوزش ہو رہی تھی۔ شاید انگلیاں زخمی ہو گئی تھیں۔ ممکن ہے زخموں سے خون بھی رِس رہا ہو۔ اندھیرے میں کہاں دکھائی دیتا ہے اور پھر رک کر دیکھنے کا وقت کہاں ہے۔ دوڑتے رہو بس یوں ہی دوڑتے رہو۔ دوڑتے رہنے کے سوا اب کوئی چارہ بھی تو نہیں۔ پانی کی سرد اور تیز بوچھار سوئیوں کی طرح اس کے جسم میں گڑ رہی تھی۔ وہ دوڑتے دوڑتے ایک لمحے کو رکتا۔ اپنے چہرے سے پانی کی بوندیں پونچھتا، بالوں کو جھٹکتا اور پھر دوڑنے لگتا۔ ہوائیں تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی تھیں۔ اندھیرے میں اونچے اونچے درختوں کی پھنگیاں بھوتوں کے سروں کی طرح ہیبت ناک لگ رہی تھیں۔ وہ چاہتا تو چند لمحوں کے لیے کسی بڑے سے درخت کے سایے میں رک کر سستا سکتا تھا۔ یا وہ بھیانک رات کسی درخت کی گھنی شاخوں میں چھپ کر گزار سکتا تھا۔ مگر ایسا کرنا اس کی فطرت کے منافی تھا۔ وہ جانتا تھا کہ چند لمحوں کا آرام اُسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپاہج کر کے رکھ دے گا۔ وہ پھر کبھی دوڑ نہیں سکے گا۔ دوڑ کر اس مندر تک نہیں پہنچ سکے گا۔ جہاں وہ بُت نصب تھا۔ جس کی زیارت سے اس کے اندر زندگی جینے کا حوصلہ پیدا ہوتا تھا اور وہ طوفانوں کا رُخ موڑ دینے کا عزم لے کر زندگی کے سمندر میں کود پڑتا تھا۔

دوڑتے دوڑتے اسے ایک ٹھوکر لگی۔ وہ لڑکھڑا کر گرا مگر گر کر فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ کہنیاں چھِل گئی تھیں۔ گھٹنوں میں بھی چوٹ آئی تھی۔ مگر اب اسے ایسی معمولی چوٹوں کی

کب پروا تھی۔ اسے تو بس کسی صورت اپنے نصب کردہ اُس عظیم بُت تک پہنچنا تھا۔ جس کے سایے میں بیٹھ کر وہ اپنی پچھلی ساری تلخیوں کو بھول سکتا تھا۔ اس سے پیش تر بھی ایسا کئی دفعہ ہوا تھا۔ جب اس کے آدرش ڈگمگانے لگتے، حوصلوں پر زنگ چڑھنے لگتا، وہ فوراً مندر کا رُخ کرتا اور اس بت کے سامنے بیٹھ کر گھنٹوں اس کے تصوّر میں محو ہو جاتا۔ دھیرے دھیرے اس کے کم زور حوصلوں کو تقویت ملتی۔ عزائم میں چٹانوں کی سی پختگی پیدا ہونے لگتی اور وہ ایک بار پھر زندگی سے جوجھنے اور اس کے سامنے سینہ سپر ہونے کا ولولہ لے کر لَوٹ آتا۔ جب سے اس نے وہ بت بنایا تھا اسے لوگوں کے درمیان گردن اٹھا کر چلنے کا فن آ گیا تھا

مصلحت، چاپلوسی اور لجاجت جیسی نامردانہ خصلتوں کو اُس نے اپنے کردار کے آئینے سے کھرچ کھرچ کر نکال دیا تھا۔ اب اس کی گفتگو میں تلوار کی سی کاٹ اور لہجے میں فولاد کی سی صلابت آ گئی تھی۔ اس کی صاف گوئی، بے باکی اور جرات مندی کے سبھی قائل ہو گئے تھے۔ مگر وہ اچھی طرح سمجھتا تھا کہ اس میں یہ ساری خوبیاں اس بت کی صحبت سے آئی ہیں۔ اس کی چال میں غرور اور گفتگو میں خود اعتمادی اسی کی صحبت کا فیض ہے۔

وہ اکثر سوچتا اس دم گھونٹو ماحول میں جینا کتنا مشکل ہے۔ جہاں اس کا ایک ایک نس سو سو پھندوں میں جکڑا ہوا ہے۔ اگر اس بت کا سہارا نہ ہوتا تو وہ کب کا اپنے ہی ہاتھوں اپنا گلا گھونٹ چکا ہوتا مگر اس بت کی قربت کا کمال تھا کہ وہ اس ماحول میں بھی نہ صرف جی رہا تھا بل کہ ایک شانِ استغنا کے ساتھ جی رہا تھا۔

جب تک اس نے وہ بت نہیں بنایا تھا خود اپنی نظروں میں کتنا حقیر اور ذلیل تھا۔ معمولی سا ہوا کا جھونکا بھی اسے تنکے کی طرح یہاں سے وہاں اُچھال دیتا تھا۔ چھوٹی سے چھوٹی ٹھوکر بھی مٹی کے کھلونے کی طرح اسے ریزہ ریزہ کر دیتی تھی۔ ایک ذرا سا صدمہ

برداشت کرنے کا بھی تو اہل نہیں تھا وہ۔
وقت کی ٹھوکروں میں اسی طرح لڑھکتے پڑکتے ایک دن اچانک اس پر یہ انکشاف ہوا کہ اسے بھی ایک بُت بنانا چاہیے۔ ایک ایسا بُت جو اس کے آدرشوں کا آئینہ ہو۔ اس کے پراگندہ خوابوں کی تعبیر ہو۔
اپنے تخیلی بت کی تعمیر کے لیے اس نے ایک عظیم الجثہ چٹان کا انتخاب کیا۔ اس چٹان کے سینے میں اسے اپنے آدرشوں کا عکس نظر آگیا تھا۔ اس نے چھینی، ہتوڑا سنبھالا اور صبح شام اپنے بت کے نقوش وضع کرنے میں مصروف ہوگیا۔ دن رات، گرمی برسات، مٹی دھول، پسینا۔ بالآخر ایک عرصے کی محنت شاقہ کے بعد وہ اپنے تخئیل کے مطابق اس بت کی تخلیق میں کامیاب ہوگیا۔ پھر اسے ایک اونچی سی جگہ نصب کرکے اس کے گرد ایک عالی شان مندر بنا دیا۔ اس بت کے بن جانے کے بعد اچانک اس پر زندگی کا مقصد واضح ہوگیا۔ بے معنویت اور مایوسی کی دھند پگھلنے لگی۔ اب تک وہ تشکیک کے صحرا میں سرابوں کے پیچھے دوڑ رہا تھا۔ اب اس پر منکشف ہوگیا تھا کہ زندگی بے آب وگیاہ صحرا ہی نہیں، سرسبز نخلستان بھی ہے اور تبھی سے اس کے رہن سہن، وضع قطع، گفتار اور کردار میں ایک نمایاں تبدیلی آگئی تھی۔
اب کیسی ہی مشکل پڑتی، کتنی ہی دشواریاں پیش آتیں، وہ ہرگز ہرگز مایوس نہ ہوتا۔ ہر کٹھن سمے وہ بت اس کے تصور میں آدھمکتا اور اس کے سینے میں عزم ویقین کی قندیلیں روشن ہوجاتیں۔ طوفان، آندھی، سیلاب ہر آفت سے وہ ہنستا مسکراتا گزر جاتا۔ کیوں کہ اس نے اس بت سے یہی سیکھا تھا۔
بجلی پھر چمکی اور اندھیرا ایک لمحے کو پگھل کر دوبارہ جامد ہوگیا۔ وہ مندر کے بالکل قریب پہنچ چکا تھا۔ بجلی کی روشنی میں اسے مندر کا بڑا پھاٹک نظر آگیا تھا۔
بس آخری چند گز کا فاصلہ رہ گیا ہے۔ اس کے بعد وہ مندر کے اندر ہوگا۔ جب

سے اس نے وہ بت بنایا تھا۔ کتنے ہی طوفان جھیل چکا تھا۔ آندھیوں اور سیلابوں سے گزر چکا تھا۔ مگر آج کا طوفان پچھلے سارے طوفانوں سے زیادہ طاقت ور اور شدید تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کے آدرشوں کی بنیادیں کانپ رہی ہیں۔ ہواؤں کے جھکڑ اس قدر تیز تھے کہ زمین پر پیر جمائے رکھنا بھی دشوار معلوم ہو رہا تھا۔ برسات کی بوچھار الگ بدن میں برچھیاں چبھو رہی تھی۔ بادل گرج رہے تھے جیسے بیک وقت ہزاروں ہاتھی چنگھاڑ رہے ہوں۔ جنگل کے کچے راستوں پر ٹخنے ٹخنے کیچڑ جمع ہو گیا تھا۔ دوڑتے دوڑتے ہر لمحہ یہ خدشہ کہ اب پھسلے کہ تب پھسلے۔ بادلوں نے آسمان کو اس طرح ڈھک رکھا تھا کہ روشنی کی ایک کرن بھی زمین پر نہیں پڑ رہی تھی۔ اندھیرا — چاروں طرف گھپ اندھیرا اور اس اندھیرے میں ہواؤں کی تیز تیز سائیں سائیں، جیسے درجنوں بدروحیں چیختی، چنگھاڑتی پھر رہی ہوں۔ وہ بے تحاشا مندر کی طرف دوڑ رہا تھا۔ جہاں پہنچ کر وہ سکون کی چند سانسیں لے سکتا تھا۔

بس، اب صرف چار قدم کا تو فاصلہ رہ گیا ہے۔ ایک آخری کوشش — پانو شل ہوتے جا رہے ہیں۔ کمر میں ٹیسیں اٹھ رہی ہیں۔ تلوے لہولہان ہو چکے ہیں اور سانس اس قدر تیز ہو گیا ہے کہ لگتا ہے ابھی پھیپھڑے پھٹ جائیں گے۔ مگر اسے رکنا نہیں ہے۔ رکنا موت کے مترادف ہوگا۔ اب اندھیرے میں بھی اس عالی شان مندر کا ہیولا نظر آنے لگا تھا۔ اس نے رفتار مزید تیز کر دی۔

ایک بار پھر بجلی چمکی، مندر کا بڑا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ بجلی کی روشنی میں مندر کے بڑے دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔ ہانپتا ہوا مندر کی دیوار سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ اس کا سینہ سمندر کی بے چین موجوں کی طرح اتھل پتھل ہو رہا تھا۔ زبان باہر نکل آئی تھی۔ حلق میں کانٹے سے پڑ گئے تھے۔ کچھ دیر تک وہ آنکھیں بند کیے اسی طرح گہری گہری سانسیں لیتا رہا۔ رفتہ رفتہ اس کی سانس کی رفتار کچھ کم ہوئی۔ اچانک ہوا کا ایک

تیز جھونکا مندر کے کھلے دروازے سے اندر داخل ہوا اور اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ ایک تیز چیخ اس کے حلق سے نکل کر فضا میں دور تک لہراتی چلی گئی۔ اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں اور بدن پر رعشہ طاری تھا۔ سامنے جو منظر دکھائی دے رہا تھا وہ اس کے لیے قطعی غیر متوقع تھا۔

وہ بت جس سے حوصلہ پانے کی توقع میں اتنی صعوبتیں جھیلتا یہاں تک پہنچا تھا منہ کے بل فرش پر پڑا تھا اور پانی کی بوچھار کھلے دروازے سے اندر داخل ہو رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہو گیا —— وہ تو —— وہ تو —— اس بت کو ناقابلِ شکست سمجھتا تھا۔ پھر اچانک یہ سب کیا ہو گیا؟ کیسے ہو گیا؟ اس کا جی چاہ رہا تھا وہ اس بت کے سرہانے بیٹھ کر پھوٹ پھوٹ کر روئے۔ اپنی شکستگی، بے بسی اور تنہائی پر آنسو بہائے۔ مگر صدمہ اتنا گہرا تھا کہ اس کے آنسو اندر ہی اندر خشک ہو گئے اور اس کی چیخیں اس کے حلق میں گھٹ کر رہ گئیں۔ پتا نہیں وہ اس طرح کب تک پتھر بنا کھڑا رہا۔ کافی دیر کے بعد جب اس کے حواس کچھ ٹھکانے لگے تو اس نے اپنے چاروں طرف ایک نظر ڈالی۔ مندر کی دیواروں پر ہیبت ناک ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ ایک طرف دروازہ ٹوٹا پڑا تھا جس سے رہ رہ کر بارش کی تیز بوچھار اندر داخل ہوتی اور مندر کا فرش گیلا کر جاتی۔ اب مندر میں بھی پانی بھرنے لگا تھا اور وہ بت دھیرے دھیرے پانی میں ڈوبتا جا رہا تھا۔ وہ کچھ لمحوں تک فرش پر اوندھے منہ پڑے اس شکستہ بت کو گھورتا کھڑا رہا۔ پھر دھیرے سے مڑا اور مندر کے دروازے سے باہر نکل گیا۔

باہر طوفانی ہوائیں اسی طرح شور مچا رہی تھیں۔ مگر اسے بہر حال اب اکیلے ہی آندھیوں کا مقابلہ کرنا تھا۔ اس دن سے اس نے دل میں تہیّہ کر لیا کہ کبھی کوئی بت نہیں بنائے گا۔

●

ایک تکونی کہانی

وہ کُل بارہ نفوس تھے ۔ پانچ مرد ، تین عورتیں اور چار بچے ۔ سب ایک دہکتے الاؤ کے گرد بیٹھے آگ کی گرمی اپنے بدن میں جذب کر رہے تھے ۔ لپلپاتی آنچ کی سُرخ روشنی میں اُن کے ننگے سائے غار کی دیواروں پر بڑے مہیب لگ رہے تھے ۔ پچھلے ایک ہفتے سے وہ سب لوگ اسی طرح الاؤ کے گرد بیٹھے آگ تاپ رہے تھے ۔ بیٹھے بیٹھے تھک جاتے تو وہیں پڑ کر سو جاتے ۔ باہر برف باری اپنے شباب پر تھی ۔ غار کے دہانے پر برف کی دیوار سی بن گئی تھی ۔ پچھلے ایک ہفتے سے انھوں نے آسمان نہیں دیکھا تھا ۔ جب بھوک ناقابلِ برداشت ہو جاتی تو چقماق کی تیز دھار سے ایک ہفتہ پہلے شکار کیے ہوئے سوّر کی چند بوٹیاں کاٹتے اور وہیں آگ پر بھون کر ایک ایک دو دو بوٹیاں حلق سے نیچے اُتار لیتے ۔ پیاس لگتی تو غار کے دہانے پر آتے اور برف کا ایک ایک ڈلا منہ میں ڈال لیتے ۔ آخر ایک سوّر بارہ آدمیوں

میں کب تک چلتا۔ دھیرے دھیرے شکار ختم ہوتا جارہا تھا۔ پچھلے دو روز سے صرف ایک ایک بوٹی پر گزارا ہونے لگا۔ اتنی کم غذا پر اس بھیانک سردی میں صرف آگ کی حرارت کسی کو کب تک زندہ رکھ سکتی تھی؟ نویں دن صبح خاندان کا سب سے بوڑھا مرد اور دو بچے نقاہت اور سردی سے اکڑ کر تختہ بن گئے۔

باقی لوگوں نے انھیں دیکھا اور چپ چاپ اُن کی لاشوں کو گھسیٹ کر غار کے دہانے پر پھینک آئے۔ وہ لوگ پھر آگ کے گرد جمع ہوگئے۔ اُن کے چہرے پتھر کی سلوں کی طرح سپاٹ تھے۔

آج جب بچے ہوئے گوشت کے ٹکڑے تقسیم ہوئے تو ایک ایک بوٹی سب کے حصے میں زیادہ آئی۔ سپاٹ چہروں پر مسرت کی ایک ہلکی سی لکیر اُبھر آئی۔ مگر خاندان کی سب سے ضعیف اور بوڑھی عورت کے چہرے پر مسرت کی یہ لکیر جلد ہی معدوم ہوگئی۔ اُس نے دیکھا کہ خاندان کے دوسرے افراد کی نگاہیں اُسی کے چہرے پر گڑی ہیں اور وہ سب لوگ اپنی آنکھوں میں عجیب وحشیانہ چمک لیے اُسے گھور رہے ہیں۔ اُس کی بوڑھی آنکھوں میں دھیرے دھیرے خوف اور بے اعتمادی کے سایے گہرے ہونے لگے۔

—

پچھلے بہتّر گھنٹوں سے وہ لوگ اُس خندق میں گھرے ہوئے تھے۔ جب دشمن نے انھیں چاروں طرف سے گھیر لیا تب وہ کل اکیّس نفوس تھے۔ مگر پچھلے بہتّر گھنٹوں کی چھوٹی چھوٹی جھڑپوں میں ایک ایک کرکے بارہ افراد موت کے گھاٹ اُتر چکے تھے۔ زندہ لوگ اپنے ہر نئے ساتھی کی موت پر سب سے پہلے اُس کے میگزین خوراک کے جھولے اور پانی کی بوتل پر قبضہ کر لیتے تھے۔ اس کے باوجود دھیرے

دھیرے اُن کا میگزین ختم ہوتا جارہا تھا۔ خوراک گھٹ رہی تھی۔ باہر سے رسد آنے کی کوئی توقع نہیں تھی۔ اُن سب کو موت کی بھیانک شکل صاف دکھائی دے رہی تھی۔ موت کسی بھی سمت سے کبھی بھی اُن پر حملہ آور ہوسکتی تھی۔

اُس نے پھر کراہنے کی آواز سُنی اور مڑ کر اپنے زخمی ساتھی کی طرف دیکھا۔ ساتھی کی پشت کے نیچے زمین پر سُرخی کا دھبّا پھیلتا جارہا تھا۔ چہرے کی زردی بڑھ گئی تھی اور دھیرے دھیرے اُس کی آنکھیں مندتی جارہی تھیں۔ جب کسی گولی کے چلنے کی آواز آتی وہ اپنی بند ہوتی ہوئی آنکھوں کو پھاڑ پھاڑ کر اس طرح دیکھنے لگتا جیسے ایک منظر اُس کی نظروں کے سامنے سے سرکتا جارہا ہو اور وہ اُسے آنکھوں ہی آنکھوں میں باندھ لینا چاہتا ہو۔

اس لاحاصل جدو جہد کا کرب اُس کے پورے چہرے سے عیاں تھا۔ اُس نے اپنے زخمی ساتھی کی اس دردناک کشمکش کو دیکھا اور اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر بندوق لوڈ کرنے لگا۔ اُسے بڑی شدید پیاس محسوس ہورہی تھی۔ مگر اُس کی بوتل تو پچھلے بارہ گھنٹوں سے خالی تھی۔ خوراک کا جھولا پہلے ہی خالی ہوچکا تھا۔

اُس نے کنکھیوں سے دیکھا۔ اُس کے زخمی ساتھی کی بغل میں پانی کی بوتل پڑی تھی۔ ابھی چند منٹ پہلے ہی اپنے ساتھی کے حلق میں پانی کے قطرے ٹپکاتے ہوئے اُس نے دیکھا تھا کہ بوتل میں ابھی دو چار گھونٹ پانی باقی ہے۔ ساتھی کے حلق میں پانی ٹپکاتے ہوئے اُس کا گلا سوکھ سوکھ گیا تھا۔ اُس نے بڑی کٹھنائی سے اپنے لرزتے ہاتھ کو اپنے قابو میں رکھا تھا۔ زخمی ساتھی کو پانی پلا چکنے کے بعد وہ دوبارہ اپنی جگہ آکر بیٹھ گیا اور ساتھی کے بجھتے چہرے پر نظریں جمائے دیکھتا رہا۔ اس کی نظر بار بار اُس کے چہرے سے پھسل کر پانی کی بوتل سے ٹکرا ٹکرا جاتی اور وہ اپنے ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ جاتا۔

اتنے میں مخالف سمت سے گولیوں کی ایک بوچھار آئی۔ ساتھ ہی اس کی بندوق سے بھی ایک گولی نکلی۔ وہ نہیں جانتا کہ اس میں اس کے ارادے کو کہاں تک دخل تھا مگر یہ سچ تھا کہ اس کی بندوق کی نال کا رُخ اپنے زخمی ساتھی کی طرف تھا۔ زخمی ساتھی زور سے اُچھلا اور یک بارگی تڑپ کر ٹھنڈا ہو گیا۔ اُس نے لرزتے ہاتھوں سے اپنے مُردہ ساتھی کی بغل میں پڑی پانی کی بوتل اُٹھالی اور بے تحاشا اُسے اپنے خشک ہوتے ہونٹوں سے لگا لیا۔

جب وہ راشن لینے چلا تو اس کا ایک ایک قدم من من بھر کا ہو رہا تھا۔ پھر راشن کی لمبی قطار دیکھ کر تو اُس پر اور بھی تھکان سوار ہو گئی۔ مگر راشن تو بہر حال لینا ہی تھا۔ تھوڑا بہت اناج جو گھر میں جمع تھا اور جسے بیوی نے گذشتہ کئی ہفتوں سے مٹھی مٹھی کر کے پس انداز کیا تھا، تعزیت پر آئے ہوئے چاچا، چاچی، چھوٹا اور اس کے بیوی بچّے صاف کر کے جا چکے تھے۔ آج سویرے تو روٹی ہی نہیں بن سکی بیکری سے بریڈ لا کر کام چلانا پڑا تھا۔ وہ راشن کی قطار میں لگ گیا اور جیب سے بیڑی نکال کر سُلگاتے ہوئے اپنے غم کو جھٹک دینے کی کوشش کرنے لگا۔ ٹھیک ہے، ماں کو دفن کیے ابھی صرف چار دن ہوئے تھے ــــ تاہم دھیرے دھیرے اُسے نارمل تو ہونا ہی ہے۔ کون زندگی بھر کسی کا ماتم کرتا ہے۔

مگر... پھر بھی ایک ننھّی سی پھانس تھی جو رہ رہ کر اُس کے دل کو کہیں سے ٹیس جاتی۔ قطار دھیرے دھیرے سرکنے لگی۔ اُس کی نظریں راشن کی دُکان کی دیوار گیر گھڑی پر جم گئیں۔ تین بجنے میں بیس منٹ باقی تھے۔ کہیں اُس کا نمبر آنے سے پہلے دُکان بند نہ ہو جائے۔

وہ بے چین ہو کر اپنے آگے قطار میں کھڑے لوگوں کی گنتی کرنے لگا۔ ایک۔ دو۔ تین ـــــ سات لوگ تھے۔ اب اُس کی توجہ پوری طرح دُکان میں لگی گھڑی کی طرف تھی۔ منٹ کی سوئی کی ہر حرکت کے ساتھ اُس کی بے چینی میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ چھے بجتے بجتے اُس کا نمبر آ گیا۔ اُس نے اطمینان سے راشن جھولوں میں بھرا۔ سُتلی سے اُن کے منھ باندھے اور انھیں اُٹھا کر گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

آج مرحومہ کی پہلی جمعرات ہے۔ شام میں شیرینی بنوا کر مرحومہ کے نام کی فاتحہ خوانی کرانی ہوگی۔ اُسے پھر ماں کی یاد آئی۔ دل پھر کچھ بھاری ہونے لگا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے ایک خیال بجلی کی سرعت کے ساتھ اُس کے دماغ میں کوند گیا۔ اُسے جو ہر ماہ بلیک سے چار چھے کلو اناج مزید خریدنا پڑتا تھا، اب اُس کی نوبت نہیں آئے گی۔ ماں کے حصّے کا راشن بھی اب انھیں کے تصرّف میں ہوگا۔ نہیں ـــــ وہ راشننگ آفس میں ماں کے مرنے کی اطلاع نہیں دے گا۔ ہرگز نہیں دے گا۔ اُس نے محسوس کیا کہ اس غیر متوقع خیال نے اُس کے من کے بوجھ کو کافی ہلکا کر دیا ہے۔

●

سنہ ۱۹۷۶ء

ننگی دوپہر کا سپاہی

اس کا جنم ہوا تو اس کا سر عام بچّوں کے سر سے کم از کم تین گنا بڑا تھا۔ ماں کی کوکھ سے برآمد ہوتے ہوتے اس کی ماں کی کوکھ کے پرخچے اڑ گئے تھے اور زمین پر اس کی پہلی چیخ کے ساتھ ہی اس کی ماں نے آخری ہچکی لی اور آسمانوں کے سفر پر روانہ ہو گئی۔ وہ فرش پر پڑا گلا پھاڑے جا رہا تھا اور اس کی باچھوں سے گرم گرم خون کی دھاریں بہہ رہی تھیں۔ دائی اسے وہیں چھوڑ کر بھاگ کھڑی ہوئی اور اس کی چیخوں سے کوٹھی کے در و دیوار کانپ اٹھے۔

"یہ بالک بہت ادبھت ہے۔ بڑا ہو کر بہت بڑا وِدوان بنے گا۔"

"اگر سنار کے کاروبار میں من نہ لگا تو سادھو سنت بن جائے گا...."

"یا بہت بڑا سیلانی بنے گا۔"

جوتشیوں نے شروع ہی سے اس کے بارے میں مختلف رائیں قائم کی تھیں۔

جب وہ گھر سے چلا تھا تو اچھی خاصی دھوپ پھیل چکی تھی۔ مگر دھوپ کی انگلیاں ابھی بہت ملائم اور گدگدی تھیں۔ اس نے یاد کرنے کی کوشش کی کہ وہ گھر سے کب نکلا تھا۔ مگر اسے صحیح صحیح کچھ بھی یاد نہیں آیا۔ نہ تاریخ، نہ دن، نہ مہینا، نہ سال، بس اتنا یاد تھا کہ جب وہ چلا تھا تو دھوپ پھیل چکی تھی اور سورج کی کرنیں ابھی سان پر نہیں چڑھی تھیں۔ مگر جوں جوں وہ آگے بڑھتا گیا برچھیاں چمکنے لگیں، تیر سنسنائے اور سورج ننگی تلوار کی طرح اس کے سر پر معلق ہو گیا۔

اس نے گردن اٹھا کر دیکھا۔ وہ شہر کے بیچ چورستے پر کھڑا تھا۔ لوگ چاروں دشاؤں میں اس طرح گھبرائے گھبرائے بھاگ رہے تھے جیسے اگلے ہی لمحے کسی بھاری بم باری کا خدشہ لاحق ہو۔

اس نے لپک کر اپنے قریب سے گزرتے ایک شخص کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"اے! تم اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟"

وہ شخص پہلے تو چونکا پھر اسے نیچے سے اوپر تک گھور کر دیکھا اور بولا۔

"تم اس شہر میں نئے آئے ہو شاید؟"

"ہاں، مگر یہ سب لوگ ایسے گھبرائے گھبرائے کہاں بھاگے جا رہے ہیں؟"

"سایے کی تلاش میں ــــ دیکھتے نہیں دھوپ کس قدر تیز ہے۔"

"وہ تو میں دیکھ رہا ہوں مگر سایہ کہاں ہے......؟"

اس کا سوال ختم ہونے سے پہلے ہی وہ شخص آگے بڑھ گیا اور اس کا سوال اس کے ہونٹوں میں دب کے ٹوٹ گیا۔

"عجیب ہے....." وہ زیر لب بڑبڑایا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اس کے چاروں طرف اونچی اونچی عمارتیں ایستادہ تھیں جن کے دروازوں پر سنتری پہرہ دے رہے تھے اور دروازوں کے سامنے انسانوں کی لمبی لمبی قطاریں لگی تھیں۔ لوگ اپنی پیشانیوں

سے پسینا پونچھتے اور گرمی سے ہائے وائے کرتے ان دروازوں تک پہنچنے کی کوشش کرتے، پھر باری باری اندر داخل ہو جاتے۔ اندر داخل ہونے سے پہلے دربان آگے بڑھتا اور ایک بڑا سا طوق اندر داخل ہونے والے کے گلے میں ڈال دیتا۔

وہ بڑی دیر تک کھڑا یہ سب کچھ دیکھتا رہا۔ وہ سوچ رہا تھا، اندر جانے والوں میں سے کوئی باہر نکلے تو اس سے اندر کا احوال پوچھے۔ مگر کافی دیر انتظار کرنے کے بعد بھی اندر جانے والوں میں سے کوئی باہر نہیں نکلا۔

دھوپ کی تمازت بڑھتی جارہی تھی اور اب پسینا اس کے ایک ایک مسام سے پھوٹ نکلا تھا۔ ایک لمحے کو اس کے جی میں آیا کہ وہ بھی قطار میں کھڑا ہو جائے اور کسی عمارت میں داخل ہو کر گھڑی دو گھڑی کو ستا لے۔ دھوپ ڈھلتے ہی دوبارہ سفر شروع کر دے گا۔ جوں ہی اس کی نظر اس طوق پر پڑی جو اندر جانے والوں کے گلے میں پہنایا جارہا تھا اس کے قدم رک گئے۔ اس نے آگے بڑھ کر قطار میں کھڑے ایک شخص سے پوچھا۔ "اے تم قطار میں کیوں کھڑے ہو؟"

"اندر جانے کے لیے۔"

"اندر کیا ہے؟"

"اندر چھاؤں ہے۔ ٹھنڈک ہے، اندر ...."

"مگر جو لوگ اندر جاتے ہیں وہ واپس کیوں نہیں لوٹتے؟"

"کیوں لوٹیں؟ باہر دھوپ میں جھلسنے کے لیے؟"

"مگر دروازے پر گلے میں ڈالا جانے والا وہ طوق؟"

"کون سا طوق؟"

"وہ دیکھو جو اندر داخل ہونے سے پہلے ہر ایک کو پہنایا جارہا ہے۔"

"محض وہم ہے تمھارا۔ تم قطار کے باہر کھڑے ہو نا اس لیے تمھیں دکھائی دے

رہا ہے، قطار میں کھڑے ہو جاؤ پھر دیکھو اندر پہنچنے کی خواہش ہر احساس پر غالب آجائے گی"

"لعنت ہے۔ زندگی احساس ہی کا تو نام ہے۔ تم سب مردہ ہو چکے ہو مردہ" اُس نے طیش میں آکر کہا۔

"اے بھائی! تم قطار میں ہو کیا؟" پیچھے سے کسی نے آواز لگائی۔ اُس نے مڑ کر دیکھا۔ اس کے پیچھے مزید کچھ لوگ آکر کھڑے ہو گئے تھے۔ اس نے سختی سے کہا۔

"نہیں ـــــ"

"تو پھر ایک طرف ہٹ کر کھڑے ہو جاؤ۔ ہمیں آگے جانے دو ...."

وہ ایک طرف کو ہٹ گیا اور اس کے پیچھے آنے والے بھی قطار میں شامل ہو گئے۔ اس کی جھنجلاہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔ اس کے جی میں آیا مشین گن سے قطار میں کھڑے ان سارے لوگوں کو بھون کر رکھ دے اور ان عمارتوں کو ڈائنامائٹ سے اُڑا دے۔ مگر اس کے پاس نہ مشین گن تھی نہ بارود۔ پیٹھ پر جو جھولا لدا تھا اس میں موٹی موٹی ادق کتابوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ حتّٰی کہ توشہ دان اور پانی پینے کا پیالہ تک وہ راستے میں کہیں چھوڑ آیا تھا کہ جو سفر اسے در پیش تھا اس میں یہ چیزیں بھی بہت ذیلی حیثیت رکھتی تھیں۔ اُس نے آگے قدم بڑھائے۔ آسمان اس کے سر پر کسی فولادی چادر کی طرح تنا ہوا تھا اور دھوپ لشکارے مار رہی تھی۔ تھوڑی دیر رستا نا تو وہ بھی چاہتا تھا کہ ذرا تازہ دم ہو لے تو دوگنی رفتار سے آگے بڑھے مگر کہاں سُستائے راستے میں نہ کوئی سایہ تھا نہ درخت ـــــ اور کسی عمارت میں داخل ہو کر اس طوق کو گلے میں ڈالنا اس کے لیے موت کے مترادف تھا۔ دھوپ تھی کہ سان پر چڑھی کٹار کی طرح تیز ہوتی جا رہی تھی۔ وہ چلتا رہا۔ آخر اسے سامنے ایک ایسی عمارت نظر آئی جس کے آگے کوئی قطار نہیں لگی تھی۔ اس نے سوچا چلو اس میں دو گھڑی کو سُستا لیتے ہیں۔ وہ کھلے دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔ چاروں طرف گھپ اندھیرا تھا۔ مگر اندر فرش پر قدم رکھتے ہی

ایک عجیب سی ٹھنڈک رگ رگ میں سرایت کر گئی اور دماغ غنودگی کی دھند میں غوطے کھانے لگا۔ البتہ ایک پُراسرار گونج اسے سُنائی دیتی رہی جیسے اس کے اطراف ہزاروں مکھیاں بھِن بھِنا رہی ہوں۔ اندھیرا اس قدر گھنا تھا کہ کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ انتظار کرنے لگا کہ شاید تھوڑی دیر بعد اس کی آنکھیں اندھیرے کی عادی ہو جائیں تو اسے کچھ دکھائی دے۔ اتنے میں ایک آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

"خوش آمدید ——" اور ساتھ ہی عمارت بھک سے روشن ہو گئی۔ چاروں طرف دیواروں سے تقدس کی شعاعیں پھوٹ رہی تھیں۔ اس نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ کہیں کوئی متنفس دکھائی نہیں دیا۔ خاموش دیواروں سے پاکیزگی جھرنوں کی طرح بہہ رہی تھی۔ اب مکھیوں کی بھِن بھِناہٹ بھی تیز ہو گئی تھی۔

"خوش آمدید —— یہاں تم کڑی سے کڑی دھوپ سے محفوظ رہ سکتے ہو"

آواز اُوپر سے آئی تھی۔ اب جو اس نے نظر اُٹھا کر دیکھا تو اسے چھت میں ایک بڑا سا جالا تنا ہوا دکھائی دیا۔ جس میں بہت سے لوگ اُلٹے ٹنگے ہوئے تھے۔ ان کی آنکھیں بند تھیں اور ہونٹ کسی قسم کے ورد میں دھیرے دھیرے ہل رہے تھے۔ وہ مکھیوں کی بھِن بھِناہٹ غالباً اسی ورد کی وجہ سے پیدا ہو رہی تھی۔ ایک کونے سے ایک بڑا سا مکڑا رینگتا ہوا اس کی طرف بڑھا جس کا سر انسانوں کا سا تھا۔ شاید اسی نے اسے خوش آمدید کہا تھا۔ وہ اپنے بڑے بڑے بازو پھیلائے اس کی طرف بڑھ رہا تھا جیسے اسے اپنی آغوش میں لے لینے کو بے تاب ہو۔ وہ گھبرا کر پلٹا اور سرپٹ بھاگتا ہوا عمارت کے باہر آ گیا۔ باہر دھوپ اسی طرح پھیلی ہوئی تھی اور لوگ سایے کی تلاش میں سرگرداں اِدھر اُدھر بھاگتے پھر رہے تھے۔ اس نے طے کر لیا کہ اب وہ کسی عمارت میں پناہ نہیں لے گا۔ چلتا رہے گا۔ چلتا رہے گا، حتیٰ کہ چلتے چلتے اس کے تلووں میں آبلے پڑ جائیں گے، ٹانگیں شل ہو جائیں گی اور اس کا بدن جھلس جھلس کر کوئلہ ہو جائے گا مگر وہ چلتا رہے گا —— اچانک

اسے کچھ شور سنائی دیا۔ ساتھ ہی فضا نعروں سے تھرّا گئی۔ اس نے نظریں اُٹھا کر دیکھا۔ بیچ سڑک پر ایک جلوس اس کے آگے آگے چلا جا رہا تھا۔ لوگوں کے ہاتھوں میں جھنڈے تھے۔ ان کی مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں اور دہانوں سے کف اُڑ رہا تھا۔ دو رویہ عمارتوں کی کھڑکیاں کھلیں ــــ عمارتوں کے مکینوں نے خوف زدہ نظروں سے اس جلوس کو دیکھا۔ ادھر فٹ پاتھ پر چلنے والے لوگ آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے۔ اسے لگا ان جلوس والوں کے ساتھ اس کا سفر آسان ہو سکتا ہے۔ وہ تیز تیز قدم اُٹھاتا آگے بڑھا اور جلوس میں شامل ہو گیا۔ سب کے ساتھ اس کی بھی مٹھیاں بھنچ گئیں، گردن کی رگیں تن گئیں اور اس نے بھی ہوا میں ہاتھ اُچھال کر ایک فلک شگاف نعرہ لگایا۔ پھر دوسرا، پھر تیسرا۔ عمارتوں کی کھڑکیاں لرز لرز گئیں۔ چھتیں کانپ اُٹھیں۔ اس نے انتہائی حقارت سے عمارتوں کے ان مکینوں کو دیکھا جو کھڑکیوں سے گردنیں نکالے خوف اور تجسّس سے جلوس والوں کو تک رہے تھے۔

تھوڑی دیر جلوس کے ساتھ چلنے کے بعد اسے کچھ خیال آیا اور اس نے اپنے ساتھ چلتے ایک پُرجوش نوجوان سے پوچھا۔

"یہ جلوس کہاں جا رہا ہے؟"

نوجوان نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ تھوڑی دیر تک اس کے سوال پر غور کرتا رہا۔ پھر کاندھے اُچکا کر بولا۔

"مجھے نہیں معلوم، اس شخص سے پوچھو۔ شاید اسے معلوم ہو"

نوجوان نے اپنے آگے چلتے ایک گنجے شخص کی طرف اشارہ کیا جو مٹھیاں بھینچ بھینچ کر نعرے لگا رہا تھا۔ اُس نے دو قدم بڑھ کر اس شخص کو روکا۔

"بھائی! یہ جلوس کہاں جا رہا ہے؟"

اس شخص کی بھِنچی ہوئی مُٹھی ہوا میں معلق رہ گئی اور منہ کھُلا کا کھُلا گنجے ماتھے

کے نیچے جُڑی اس کی حیران آنکھیں تھوڑی دیر تک اس کا جائزہ لیتی رہیں۔ پھر بڑی مشکل سے وہ بولا۔

"مجھے — مجھے معلوم نہیں — اس شخص سے پوچھو۔ شاید وہ بتا سکے"

اس نے اپنے آگے چلتے ایک دوسرے معنک شخص کی طرف اشارہ کیا۔ اس نے عینک والے کا بازو تھام کر پوچھا۔

"بھائی! یہ جلوس ....."

"مجھے نہیں معلوم"

"یہ جلوس —"

"مجھے نہیں معلوم"

وہ بڑھتے بڑھتے جلوس کے ایک دم آگے نکل آیا۔ ایک شخص پرچم اُٹھائے آگے آگے چل رہا تھا۔ اس نے اس سے بھی وہی سوال کیا۔

"یہ جلوس کہاں جا رہا ہے؟"

"مجھے بھی نہیں معلوم۔ مگر ہاں کچھ دیر پہلے ہمارے آگے ایک اور جلوس گزرا تھا۔ شاید انھیں پتا ہو"

جلوس کے آگے ایک اور جلوس۔ پھر اس کے آگے ایک اور .... وہ تھک ہار کر جلوس کے باہر نکل آیا۔

"کہاں جا رہے ہو؟" جلوس میں سے کسی نے پکارا۔

"نہ تم جانتے ہو کہ تم کہاں جا رہے ہو؟ نہ میں جانتا ہوں کہ میں کہاں جا رہا ہوں۔ کوئی نہیں جانتا کہ ہم سب کہاں سے چلے تھے، کہاں جا رہے ہیں۔ جب سفر ہی زندگی کی شرط ٹھہری تو پھر یہ سفر اکیلے بھی جاری رکھا جا سکتا ہے، بھیڑ کا احسان کیوں لوں"

پکارنے والے کا منہ لٹک گیا۔ اس نے پیٹھ پر لدا کتابوں کا جھولا سنبھالا اور

چپ چاپ دوسری سڑک پر مڑ گیا۔ اس سڑک پر بھیڑ نسبتاً کم تھی۔ اکا دکا لوگ گردنیں جھکائے اپنی اپنی سوچوں میں گم کسی سمت چلے جا رہے تھے۔ خاموش خاموش اور کھوئے کھوئے سے۔ وہ بھی چلتا رہا۔ گلی اور سڑکیں، نکڑ اور چوراہے۔ دھوپ ہر جگہ اس کے سر پر مسلّط رہی۔

اچانک بچوں کی قلقاریوں نے اس کے قدم روک لیے۔ اس نے دیکھا کہ سڑک کے دائیں طرف ایک پارک میں کچھ بچے کھیل رہے ہیں۔ معصوم، بھولے بھالے، گل گوتھنے سے بچے اسے بڑے اچھے لگے۔ کچھ بچے تتلیاں پکڑ رہے تھے۔ کچھ سبزے پر لوٹیں لگا رہے تھے اور بعض خواہ مخواہ ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ وہ ایک طرف کھڑے ہو کر ان کی معصوم حرکتیں دیکھتا اور شوخ قلقاریاں سنتا رہا۔ تبھی ایک شخص پارک میں داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر بھی بچوں ہی کی سی معصومیت تھی اور گلے میں ایک جھولا لٹک رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی بچے ہنستے قلقارتے اس کے گرد جمع ہو گئے۔ نووارد نے اپنے جھولے سے میٹھی گولیاں، ٹافیاں اور کچھ کھلونے نکالے اور بچوں میں تقسیم کرنے لگا۔ بچوں کے چہرے کھلے پڑ رہے تھے اور نووارد کا چہرہ اس مسرّت کے آئینے میں دمک رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے اپنا جھولا خالی کر دیا۔ بچے ہنستے کھِل کھِلاتے دوبارہ اپنے کھیلوں میں منہمک ہو گئے اور نووارد مسکراتا ہوا جدھر سے آیا تھا اُدھر لوٹ گیا۔

اس کے بھی جی میں آیا کہ وہ بھی بچوں کو قریب سے دیکھے، ان کے پھول جیسے جسموں کو چھوئے، ان کی معصوم ہنسی کو اور پاس سے سُنے۔ مگر وہ ان سے قریب کیوں کر ہو؟ انھیں دینے کے لیے اس کے پاس کچھ بھی تو نہیں تھا۔ نہ کھلونے نہ مٹھائی۔ اس نے اپنے سفر کے دوران زندگی کے اس رُخ پر غور ہی نہیں کیا تھا۔ اُس نے اپنی پیٹھ پر لدے جھولے کو ٹٹولا مگر وہاں موٹی موٹی مجلد کتابوں کے سوا کیا تھا۔ آخر اُس نے ڈرتے ڈرتے

ایک بچّے کو اشارے سے اپنے پاس بلایا۔ بچّہ ایک تتلی کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ اس کا اشارہ پاتے ہی ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ پھر دھیرے دھیرے چلتا ہوا اس کے پاس آیا۔ مگر جیسے ہی اس نے اس کے گال پر تھپکی دینے کو ہاتھ بڑھایا وہ خوف زدہ آواز میں چیخا۔

"بھ ـــ بھو ـــ ت ـــ" اور ایک طرف کو بھاگا۔

سارے بچّے چونک کر اسے دیکھنے لگے۔ پھر تو سبھی بھوت بھوت چلاتے ہوئے بھاگ کھڑے ہوئے۔ وہ بہت حیران ہوا۔ شاید سفر نے اس کا حلیہ ہی بگاڑ دیا ہو۔ ابھی وہ اسی تذبذب میں کھڑا سوچ رہا تھا کہ کیا کرے ـــ دو چار لوگوں نے آکر اسے پکڑ لیا۔

"کیوں بے! بچّوں کو ڈراتا ہے؟"

ایک نے اس کے جھولے کو تھپ تھپاتے ہوئے کہا۔

"کیوں بچّے پکڑتا ہے؟ جھولے میں کیا ہے؟"

وہ گونگا بہرا بنا ایک ایک کا منہ تک رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ وہ ان لوگوں کے سوالوں کا کیا جواب دے۔ اتنے میں پولیس کا ایک سپاہی ہجوم کو چیرتا ہوا اس کے پاس آیا۔ اس کا حلیہ دیکھا۔ لوگوں کی شکایت سُنی۔ کتابوں کے جھولے میں جھانکا اور اعلان کیا۔

"ارے کچھ نہیں ـــ جانے دو پاگل ہے۔ جھولے میں بچّہ وچّہ نہیں خالی ردّی ہے ـــ اے جا ـــ ادھر جا ـــ چل راستہ پکڑ ـــ"

اور وہ ایک طرف مڑ کر راستہ پکڑے چلنے لگا۔ غصّے، ندامت اور انتقام کے جذبے سے اس کا بدن کانپ اٹھا۔ مٹھیاں بھنچ گئیں اور گردن کی رگیں پھڑپھڑانے لگیں۔ وہ ایک ایک سے چیخ چیخ کر کہنا چاہتا تھا۔ "تم جاہل ہو، دنیا کے اسیر، تم میری عظمت کو کیا سمجھو ـــ تم سب کنوئیں کے مینڈک ہو، سمندر کی موجوں کے تھپیڑے

تمھارے نصیب میں کہاں؟ چہار دیواری کے تابوتوں میں دفن لاشیں، زندہ لاشیں۔
۔ مگر وہ غصّے کو کڑوی دوا کی طرح گھونٹ گیا کہ جاہلوں سے گرمی سے نہیں نرمی سے گفتگو کرنا ہی پیمبروں کا شیوہ رہا ہے۔

وہ ایک نکڑ پر رُک گیا۔ پھر سڑک کے کنارے ایک ٹوٹے ہوئے چبوترے پر چڑھ کر اپنی پوری قوت سے چلّایا۔

"لوگو!" سڑک اور فٹ پاتھ سے گزرتے لوگ چونک چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔

"لوگو! اِدھر آؤ ــــ" وہ چیخ رہا تھا۔

"میں زندگی کے رازہائے سربستہ سے واقف ہوں جنھیں تم اپنی جہالت کے کارن سمجھنے سے قاصر ہو۔"

لوگ جمع ہونے لگے۔ ایک شخص نے پوچھا۔ "تم کون ہو؟"

"میں ــــ میں ــــ" وہ تھوڑا سٹپٹایا۔ پھر سنبھل کر بولا۔

"یہ سوال ہی فضول ہے۔ میں کوئی بھی ہوں۔ اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ میں کیا کہہ رہا ہوں اسے غور سے سنو ــــ"

"تم سب کچھ جانتے ہو؟"

"ہاں میں نے علم کو شراب کی طرح پیا ہے اور کتابوں کو کاکروچ کی طرح چاٹا ہے ــــ میں نے ....."

"اچھا تو پھر کوئی ایسی ترکیب بتاؤ کہ ہمارے پیٹوں سے بندھے یہ پتھر موم بن کر پگھل جائیں۔"

"ہمیں بتاؤ کہ ہماری دُمیں تو جھڑ گئیں۔ آخر ہمارے ناخن اور دانت کب جھڑیں گے؟"

"ہمارے گرد روز بہ روز تنگ ہوتی یہ دیواریں کب گریں گی؟"

"یہ دھوپ کب ڈھلے گی۔"
وہ ہر سوال پر اپنی پیٹھ سے بندھی ایک ایک کتاب کھولتا، ان کے ورق الٹتا پلٹتا پھر حیران نظروں سے ایک ایک کا منہ تکنے لگتا ـــــ وہ کیا جواب دے۔ اس نے ایسے نامعقول سوالوں پر تو کبھی غور ہی نہیں کیا تھا ـــ اسے خاموش اور حیران دیکھ کر لوگ چیخ پڑے۔

"تم جھوٹے ہو، تم کچھ نہیں جانتے۔ تم زندگی کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔"
لوگوں کی بھیڑ چھٹنے لگی اور وہ گونگا بنا انھیں منتشر ہوتے دیکھتا رہا۔ دیکھتے ہی دیکھتے مجمع غائب ہو گیا اور وہ تنہا حیران پریشان اس ٹوٹے چبوترے پر کھڑا دھوپ کو اپنے مساموں میں اُترتا محسوس کرتا رہا۔ اس کی پیٹھ کتابوں کے بوجھ سے دہری ہو گئی تھی۔ آخر وہ اس بوجھ کو کب تک ڈھوئے ڈھوئے پھرے گا۔ اس نے جھولا پیٹھ سے اُتار کر زمین پٹکا۔ سیدھا کھڑے ہو کر دو چار گہری سانسیں لیں پھر جُھک کر جھولے سے ایک کتاب نکالی، کچھ دیر تک اسے اُلٹ پلٹ کر دیکھتا رہا، پھر دوسرے ہی لمحے ـــ چر ـــ چر ـــ اس کے ورق پھاڑ کر ہوا میں اُچھال دیے۔

ایک کتاب ـــــ دوسری کتاب ـــــ پھر تیسری کتاب ـــــ
اتنے میں اسے دور سے ایک شخص آتا دکھائی دیا۔ وہ شخص لمبے لمبے ڈگ بھرتا اسی کی طرف آرہا تھا اور ہاتھ کے اشارے سے اسے کتابیں پھاڑنے سے منع کر رہا تھا۔ وہ رُک گیا۔ وہ شخص قریب آیا۔ اس کے سینے سے بھی کچھ کتابیں بندھی ہوئی تھیں۔ اس شخص نے قریب پہنچ کر ہانپتے ہوئے کہا۔ "یہ تم کیا کر رہے ہو؟"
"کیا ہوا؟" اس نے سرخ سرخ آنکھوں سے اس شخص کو گھورتے ہوئے پوچھا۔
"تم کتابوں کو کیوں پھاڑ رہے ہو؟"
"یہ ساری کتابیں جھوٹ کا پلندا ہیں۔"

"تم پچھتاؤ گے۔ آگے سفر میں یہی کتابیں تمھاری رہنمائی کر سکتی تھیں۔"

"میں کتابوں کی رہنمائی ہی میں تو یہاں تک آیا ہوں۔ مگر اب میں اپنا آگے کا سفر بغیر کتابوں کی مدد کے جاری رکھنا چاہتا ہوں۔"

"ناممکن ــــــ"

"کچھ بھی ناممکن نہیں۔ کیا کتابوں سے پہلے لوگ سفر نہیں کرتے تھے۔ تم بھی یہ ڈھونگ بند کرو۔"

اس نے ہاتھ بڑھا کر اس شخص کے سینے سے بندھی کتابوں کو نوچ لینا چاہا۔ وہ شخص گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا۔

"نہیں، نہیں میں کتابوں کے بغیر ایک قدم بھی نہیں چل سکتا۔"

"تو پھر ہٹو ـــــ میرا راستہ چھوڑو ـــــ"

وہ شخص گھبرا کر ایک طرف کو ہٹ گیا اور وہ تیز تیز قدم اُٹھاتا آگے بڑھ گیا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ شخص اپنے سینے پر جھکا کتاب میں کچھ ٹٹول رہا تھا۔ وہ اب شہر کی اونچی اونچی عمارتوں، پُرہجوم سڑکوں اور خوش نما باغات کو پیچھے چھوڑتا جا رہا تھا۔ اس کے دائیں بائیں آگے پیچھے چلنے والوں کی تعداد بھی گھٹنے لگی۔

لوگ چلتے چلتے اچانک دو رویہ اونچی اونچی پتھریلی عمارتوں میں داخل ہو جاتے۔ بعض سستانے کو دیواروں کے سایے میں کھڑے ہو جاتے۔ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے دیواریں شق ہو جاتیں اور سایے سایے میں ضم ہو جاتے۔ اسے لگ رہا تھا وہ راستے بھر بے شمار میتوں کو اپنے ہاتھوں قبر میں سلاتا آیا ہے۔ جنازے ڈھوتے ڈھوتے اس کے کاندھے ٹوٹنے لگے ہیں اور اب وہ کسی بھی قسم کا بوجھ ڈھونے کا اہل نہیں۔ حتّٰی کہ اپنا وجود بھی اسے اپنی ٹانگوں پر گراں گزر رہا تھا۔

سب دھوکا، سب فریب۔ دوست احباب، عزیز رشتے دار، گھر، جائداد،

خاندان، عزّت، یہاں تک کہ کتابیں بھی دھوکا ہیں ــــ اور زندگی ؟ نہیں ــــ زندگی ایک سوال کی شکل میں اس کے آگے آگے چل رہی تھی اور وہ دیوانہ وار اس کے پیچھے لپکا جارہا تھا۔ چلتے چلتے اس کا سانس پھولنے لگا تھا۔ مگر ایک پُراسرار کشش ایک نامعلوم تجسّس اس کے قدم رکنے نہیں دے رہا تھا۔ وہ راستے میں پڑنے والی ہر دل فریب چیز سے نظریں چُراتا، دامن بچاتا ایک بگولے کی طرح اڑا جارہا تھا۔

اب اسے صاف اور سیدھے راستوں سے بھی چڑ سی ہوگئی تھی۔ وہ سیدھی سڑک سے اتر کر ایک اوبڑ کھابڑ راستے پر ہولیا جہاں دونوں جانب خاردار جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں اور قدم قدم نکیلے پتھر بچھے تھے۔ جھاڑیوں سے الجھ الجھ کر اس کے کپڑے تار تار ہو گئے۔ اتنی ٹھوکریں لگیں کہ پیروں کی انگلیاں لہولہان ہوگئیں۔ مگر وہ چلتا رہا۔ اب چلنا ہی اس کا مقدر تھا۔ پیاس کے مارے اس کے حلق میں کانٹے سے پڑ گئے۔

خاردار جھاڑیوں کا سلسلہ ختم ہو چکا تھا اور اب سامنے تاحدِّ نظر خشک ریت کے تودوں کے سوا کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ آسمان پر سورج اب بھی ننگی تلوار کی طرح ٹنگا ہوا تھا اور حلق میں کٹیلی جھاڑیاں پھیلتی جارہی تھیں۔

پانی ــــ صرف دو گھونٹ پانی ــــ

راستے میں کتنے کنویں، جھرنے چھوڑ آیا تھا وہ۔ مگر کسی جگہ رک کر اپنا حلق تر کرنا اس نے مناسب نہیں سمجھا تھا کہ زندگی مسلسل سفر کا نام ہے اور اب وہ سفر میں اتنی دور نکل آیا تھا کہ واپسی کا راستہ تک بھول گیا تھا۔

کاش، کاش ــــ کہیں سے دو گھونٹ پانی مل جائے کہ اس کے حلق میں اُگے کانٹے پھول بن جائیں۔

تبھی ایک معجزہ رونما ہوا۔ اس کی نظر ایک سیاہ نقطے پر پڑی۔ نقطہ متحرک تھا۔ اس نے غور سے دیکھا۔ نقطے کا حجم دم بہ دم پھیلتا جارہا تھا۔ پھر نقطہ لکیر بنا اور وہ

لکیر دیر تک سکرین پر کانپتے کسی برقی خط کی طرح ایتھر میں لزرتی رہی ـــ رفتہ رفتہ لکیر کا حجم بھی پھیلنے لگا اور دیکھتے دیکھتے وہ لکیر پرچھائیں میں تبدیل ہوگئی۔ یہ پرچھائیں ڈولتی، لڑکھڑاتی اسی کی سمت بڑھ رہی تھی۔ اس نے دھوپ سے بچنے کے لیے پیشانی پر ہاتھ رکھ کر جب آنکھوں پر زور دیا تو دیکھا کہ وہ ایک انسانی وجود ہے جو اسی کی طرح خستہ اور تباہ قدم قدم اسی کی سمت بڑھ رہا ہے۔ قریب اور قریب۔ اب وہ اسے صاف صاف دیکھ سکتا تھا۔ وہ ایک عورت تھی جس کے بال شانوں پر بکھرے تھے۔ چہرہ دھوپ سے جھلسا ہوا تھا اور کپڑے بدن پر چیتھڑوں کی شکل میں جھول رہے تھے۔ البتہ اس کی آنکھیں! ایسی ممتا، ایسی شفقت اس نے بہت کم آنکھوں میں دیکھی تھی۔ جیسے صحرا میں دو پھول کھلے ہوں۔ عورت اس کے قریب آکر رک گئی۔ ان شبنمی آنکھوں کی ٹھنڈک اسے بھیتر تک شاداب کر گئی۔ اس نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ پھر پھنسی پھنسی آواز میں بولا۔ "پانی ـــ پانی ہے تمہارے پاس؟"

عورت کے تھکے ہوئے چہرے پر سکون اور اطمینان کی لہر سی دوڑ گئی۔ آنکھوں سے شفقت کے سوتے ابل پڑے۔ اس نے جھٹ اپنی قبا کے بند کھول دیے۔ بھری بھری چھاتیاں خرگوشوں کی طرح پھدک کر باہر نکلیں۔ چھاتیاں دودھ سے تنا گئی تھیں اور ان کی بونڈیوں سے دودھ کی ننھی ننھی بوندیں ٹپک رہی تھیں۔

عورت نے اپنی باہیں پھیلادیں۔ اس نے تڑپ کر اس کے سینے میں اپنا چہرہ چھپالیا۔ عورت وہیں جلتی ہوئی ریت پر پھسکڑا مار کر بیٹھ گئی۔ وہ اس کے سینے میں منہ گڑائے، آنکھیں بند کیے کسی بھوکے بچے کی طرح چسر چسر دودھ پینے لگا اور عورت اس پر اپنے پھٹے آنچل کا سایہ کیے پیار سے اس کے بالوں میں انگلیاں چلانے لگی۔

ـــ چلاتی رہی ـــ

●

سنہ ۱۹۷۶ء

اُس دن کی بات

نہیں ۔ آپ لوگ مجھ سے میرا نام مت پوچھیے ۔ مجھے اپنا نام یاد نہیں ، شاید آپ یقین نہ کریں مگر میں سچ کہہ رہا ہوں ۔ مجھے اپنا نام بھی بھول گیا ہے ۔آپ اسے میری گستاخی پر محمول کریں یا مجھے مغرور و متکبر سمجھیں ۔ میں اپنا نام نہیں بتاؤں گا ۔ نہیں میں اپنا دھرم یا مذہب بھی نہیں بتاؤں گا ۔ بتا ہی نہیں سکتا ۔

نہ میں کبھی مسجد میں گیا ہوں ، نہ میں نے کسی مندر کو دیکھا ہے ، میرے لیے مندر، مسجد، کعبہ، کیلاش سب کنکر پتھر سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتے ۔ میں نے اللہ، ایشور، رام اور رحیم کے نام ضرور سنے ہیں ۔ مگر میرے اندر ان ناموں سے کبھی کوئی جوت نہیں جگی جس سے میرے وجود کے گرد پھیلا ہوا اندھیرا کم ہوتا ۔ میں مادر زاد اندھا ہوں ۔ میرے لیے یہ سنسار صرف آوازوں کا جنگل ہے ۔ میرا وجود بھی اس جنگل میں ایک بھٹکی ہوئی آواز ہے اور بس ۔ میں

فلسفی نہیں ہوں مگر چوں کہ میں اندھا ہوں۔ اس لیے اپنے سے باہر کی چیزوں کو نہ دیکھ سکتا ہوں نہ ہی اُن کا صحیح تصور رکھتا ہوں۔ میں ہمیشہ اپنے ہی بھیتر جھانکتا رہتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ میں اپنے آپ کو اچھی طرح پہچانتا ہوں۔ اس خانقاہ میں اکثر بڑے بڑے سادھو فقیر آکر ٹھہرتے ہیں۔ چند گھنٹے سُستا کر یا دو چار روز ٹھہر کر پھر آگے کی راہ لیتے ہیں۔ انھیں سادھوؤں فقیروں کی باتیں سُن سُن کر میں اِس سنسار کو جاننے سمجھنے لگا ہوں۔ ان لوگوں کی ساری باتیں تو میری سمجھ میں نہیں آتیں، مگر پھر بھی جو کچھ میں سمجھ سکتا ہوں۔ اُسے سمجھنے کی میں نے کوشش کی ہے۔ وہ لوگ اکثر دھرم آتما، پرماتما، زندگی اور موت جیسے بڑے بڑے مسئلوں پر گفتگو کرتے ہیں۔ اُن کی گفتگو نے ہی میری رُوح کو تھوڑی بہت روشنی سے آشنا کرایا ہے۔ ان سادھو فقیروں میں سبھی علم و عرفان کی باتیں کرنے والے نہیں ہوتے۔ بل کہ اکثر جاہلوں اور معمولی لوگوں جیسی ہی باتیں کرتے ہیں۔ بل کہ میں نے محسوس کیا ہے کہ ان میں بہت سے چور ڈاکوؤں اور بدمعاشوں سے بھی بدتر ہوتے ہیں۔

میں کسی کو دیکھ تو نہیں سکتا۔ مگر میرے کان اب اتنے آواز شناس ہو گئے ہیں کہ میں صرف آواز سُن کر آدمی کی فطرت کا اندازہ لگا سکتا ہوں۔ باتیں سُن کر اس کی آتما میں جھانک سکتا ہوں۔ سچ پوچھیے تو میرے کان ہی اب میری آنکھیں بن گئے ہیں۔ جو کام آپ آنکھوں سے لیتے ہیں وہی کام میرے کان بہ خوبی انجام دے لیتے ہیں۔ بل کہ آپ کی آنکھیں دھوکا کھا سکتی ہیں مگر میرے کان دھوکا نہیں کھا سکتے۔ مجھے نہیں معلوم، سچ، جھوٹ، نیکی، بدی، پاپ، پن کسے کہتے ہیں۔ میں اِن چیزوں کے درمیان کوئی خطِ فاصل نہیں کھینچ سکتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ سچ اور جھوٹ، خیر اور شر، پاپ اور پن یہاں سمندر کے کنارے ریت

کی طرح بکھرے ہوئے ہیں۔ آپ نے اُن چار اندھوں کی کہانی سُنی ہو گی جن کے سامنے ہاتھی لایا گیا تھا۔ اُن اندھوں میں سے ہر ایک نے ہاتھی کے جس عضو کو چھُوا، اُسی کو پورا ہاتھی سمجھ بیٹھا، یہ سنسار بھی میری طرح اندھوں کا سنسار ہے جس کے ہاتھ جو چیز لگ جائے اسی کو سچائی سمجھ بیٹھتا ہے۔ سچائی کیا ہے شاید کسی کو نہیں معلوم۔

مجھے گیتا، وید، قرآن، بائبل اور گرنتھ صاحب کی بہت سی آیتیں اور شلوک یاد ہیں۔ ان کتابوں میں بھی کہیں سچائی کی صحیح تفسیر نہیں ملتی البتہ یہ سب سچائی کو پانے کا راستہ ضرور بتاتی ہیں۔ دنیا کے سارے دھرم اور مذہب سچائی نہیں ہیں۔ صرف سچائی کی طرف جانے کے راستے ہیں۔ یہ راستے مختلف سمتوں سے ایک ہی منزل کی طرف جاتے ہیں۔ ان میں سے کوئی راستہ کسی دوسرے راستے کو قطع نہیں کرتا۔

مجھ سے نہ پوچھیے میں تو اندھا ہوں۔ مجھے تو کوئی سا بھی راستہ سجھائی نہیں دیتا۔ ان آنکھ والوں سے پوچھیے جو اپنا راستہ چلنے کی بجائے دوسروں کے راستے میں کانٹے بچھاتے پھرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو نہ خود امن سے رہتے ہیں نہ دوسروں کو رہنے دیتے ہیں۔ اگر آپ آنکھ والے ہیں تو ایسے شر پسندوں کو پہچاننے میں آپ کو ذری بھی دقت نہیں ہو گی۔

آپ نے پھر میرا نام پوچھا۔ میں نے پہلے ہی کہہ دیا ہے کہ میں اپنا نام نہیں بتاؤں گا۔ چاہے آپ مجھے قتل کر دیں۔ میرے ٹکڑے اڑا دیں۔ میں موت سے نہیں ڈرتا۔ جس کے لیے زندگی میں کوئی کشش نہ ہو، کوئی مقصد نہ ہو، جس کے لیے جینا صرف ایک مجبوری ہو، وہ موت سے کیوں خوف کھائے۔ میری زندگی اب اس مقام پر آکر ٹھہر گئی ہے جہاں سے موت کی سرحد شروع ہوتی ہے۔ میری

باتیں شاید آپ کو عجیب لگ رہی ہوں گی۔ میں اندھا ہوں نا۔ جس طرح کوئی اندھا متواتر کسی ایک سمت میں نہیں چل سکتا اُسی طرح اُس کی باتوں کی بھی کوئی سمت مقرر نہیں ہوتی۔ اس کی زندگی کی طرح اس کی باتیں بھی بے ربط ہوتی ہیں۔

آپ میرا نام پوچھ رہے تھے مگر میں اپنا نام نہیں بتانا چاہتا۔ وجہ؟ ہاں وجہ ضرور بتاؤں گا۔ میں اس خانقاہ میں تقریباً چالیس برس سے رہتا ہوں۔ اس خانقاہ میں آنے سے پہلے میں خوب گھوما بھٹکا ہوں۔ ہندوستان کے تقریباً سبھی تیرتھ گا ہوں اور متبرک مقامات پر حاضری دے چکا ہوں۔ کنیا کماری کے مندروں سے لے کر ہمالیہ کی گپھاؤں تک کی خاک چھان چکا ہوں۔ پہلی اور دوسری بڑی جنگوں کی ہولناک خبریں مجھے آج بھی یاد ہیں۔ 'بھارت چھوڑدو' اور 'ترکِ موالات کی تحریکوں نے میرے سامنے جنم لیا۔ مُلک کا بٹوارا اور بٹوارے کے بعد افراتفری کا بھی مجھے خوب علم ہے۔ کتنی قیامتیں گزر گئیں۔ کتنی بار موت میرے قریب سے کترا کر نکل گئی مگر میں زندہ رہا۔ زندگی کا پھندا میرے گلے میں پڑا رہا اور میں موت کی خلا میں جھولتا رہا۔ ہر چند کہ زندگی میرے لیے ایک پھندا تھی، مگر میں کسی طور زندگی سے جڑا ہوا تھا۔ لیکن اُس دن کے بعد سے میں محسوس کر رہا ہوں کہ اب یہ پھندا کٹ جائے تو بہتر ہے۔ زندگی کی وہ ڈور جس سے میری سانسوں کے تار بندھے ہیں اب ٹوٹ جائے تو اچھا ہو۔

اُس دن کی بات ہے۔ اُس دن اس خانقاہ میں چند سادھو ٹھہرے ہوئے تھے۔ انھوں نے اپنے ہاتھوں سے بھوجن بنایا۔ دو روٹیاں اور تھوڑی سی سبزی مجھے بھی پروسی۔ میں انھیں حلق سے اتارنے کے بعد بیڑی سلگا کر اپنے بستر پر پڑ رہا۔ وہ سادھو جن بھی کھانا کھانے کے بعد بیٹھے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ وہ سب بندھیا گری کی وادی سے آئے تھے اور ہری دوار

جا رہے تھے۔ میں حسب عادت اپنے بستر پر پڑا اُن لوگوں کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ سب شہر میں ہونے والے کسی بلوے کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ اُن میں سے ایک بھکشا مانگنے آبادی میں گیا تھا اور ابھی تک نہیں لوٹا تھا، وہ سب اسی کے بارے میں متفکر تھے۔ اُن کی باتوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ شہر میں بھاری بلوا ہو گیا ہے اور بلوا بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ کچھ کچھ اندازہ تو مجھے بھی ہو گیا تھا۔ کیوں کہ چیخ پکار اور نعروں کی آوازیں میں بھی سُن رہا تھا۔ شاید رات کے دس بجے تھے۔ یہ بات بھی انھیں سادھوؤں کی باتوں سے معلوم ہوئی۔ ورنہ ہم اندھوں کے لیے تو رات اور دن دونوں برابر ہیں۔ اب میں بھی بستر سے اُٹھ کر بیٹھ گیا کیوں کہ چیخ، پکار اور نعروں کی آوازیں لمحہ بہ لمحہ بڑھتی ہی جا رہی تھیں۔ وہ سادھو اپنے ساتھی کے بارے میں بہت پریشان جان پڑتے تھے۔ ان میں سے کچھ اسی وقت وہاں سے چل دینا چاہتے تھے۔ مگر کچھ شہر گئے ہوئے ساتھی کے آجانے تک رُکنے کے لیے کہہ رہے تھے۔ ابھی وہ لوگ اس مسئلے پر باتیں کر ہی رہے تھے کہ اتنے میں اُن میں سے کوئی چیخا۔

"ارے، وہ دیکھو رام داس آ رہا ہے۔"

اتنے میں اُن کا ساتھی رام داس بھیتر آیا اور ہانپتی آواز میں بولا۔

"ہے بھگوان! میں تو ڈر رہا تھا کہ آپ لوگ چلے نہ گئے ہوں۔" لہجے سے وہ کافی گھبرایا سا لگ رہا تھا۔ اُنھوں نے اُس پر سوالات کی بوچھار کر دی۔ وہ اُسی طرح ہانپتا ہوا بولا۔ "اب جلدی سے یہاں سے نکل چلو شہر میں بُری طرح بلوا ہو گیا ہے۔ یہ جگہ بھی محفوظ نہیں ہے۔"

"پر یہ ہوا کیسے؟"

مجھے نہیں معلوم، کہ کیسے ہوا۔ مگر یہاں آتے آتے میں نے تقریباً چودہ

لاشیں دیکھی ہیں۔ لوگ پاگلوں کی طرح چاقو بھالے لیے ایک دوسرے کو قتل کر رہے ہیں۔ پورا شہر آگ میں جل رہا ہے۔ میں چھوٹی چھوٹی گلیوں سے بچتا بچاتا آیا ہوں۔"

"مگر دنگا کرنے والے کون ہیں ؟"

"بھئی کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کون لوگ ہیں۔ مگر اندازہ یہی ہے کہ ہندو مسلم بلوا ہے۔ بلوا اچانک شروع ہو گیا اور اب پورا شہر اس کی لپیٹ میں ہے۔ میں جلدی جلدی سڑک سے گزر رہا تھا۔ سامنے ایک مسجد بُری طرح جل رہی تھی۔ میں وہاں سے ایک گلی میں مُڑ گیا۔ چند قدم بھی نہیں چلا تھا کہ کچھ لوگ لاٹھیاں لیے ہوئے "اللہ اکبر" کے نعرے لگاتے ہوئے میری طرف لپکے۔ میں وہاں سے سرپٹ بھاگا۔ بھکشا کا جھولا اور کمنڈل بھی وہیں چھوٹ گیا۔ میں جس گلی سے بھی گزرا وہاں دو ایک مکانات جلتے ہوئے نظر آئے۔" اتنے میں ان میں سے ایک موٹی آواز والا سادھو گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔

"ارے اب یہاں سے نکل چلو۔ باقی باتیں راستے میں پوچھ لینا۔ اس آشرم سے تھوڑے ہی فاصلے پر مسلمانوں کا محلہ ہے۔ کہیں انھوں نے اِدھر کا رُخ کیا تو سب کا ہوم کر کے رکھ دیں گے۔" وہ لوگ جلدی جلدی اپنا سامان سمیٹنے لگے۔ اُن میں سے ایک نے مجھ سے پوچھا۔ "کیوں سورداس تم نہیں چلو گے ؟"

"نہیں بابا! میں کہاں جاؤں گا۔ ویسے بھی مجھ اندھے بڈھے کو مار کر کسی کو کیا ملے گا۔"

"ایسا نہ کہو سورداس! یہ مسلمان بڑے قسائی ہوتے ہیں۔ وہ کسی کو نہیں چھوڑتے۔"

سادھو کی یہ بات سن کر مجھے بُرا لگا۔ مگر میں چُپ رہا۔ بُرا اس لیے لگا کہ میں تقریباً چالیس برس سے اسی مسلم محلّے سے بھکشا مانگ کر اپنا پیٹ بھر رہا ہوں۔

وہاں کا بچّہ بچّہ مجھے جانتا ہے اور سب مجھے بابا کہتے ہیں۔ میں نے سادھو کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا وہ لوگ جلدی جلدی اپنا سامان سمیٹ کر میرے لیے بھگوان سے پرارتھنا کرتے ہوئے آشرم سے باہر نکل گئے۔ کچھ دیر اُن کے پیروں کی دُور ہوتی ہوئی آہٹیں سنائی دیتی رہیں۔ پھر وہ آوازیں رات کے سنّاٹے میں کہیں ڈُوب گیئں اور اب شہر میں ہونے والے بلوے کا شور مجھے اور صاف سنائی دینے لگا۔

اُس شور میں "ہر ہر مہادیو" اور "اللہ اکبر" کے نعرے برچھیوں کی طرح میرے کانوں میں کھب رہے تھے۔ میں نے کبھی کسی آدمی کو قتل ہوتے یا مرتے نہیں دیکھا۔ نہ میں کسی گھر، مندر یا مسجد کے جلنے کا تصور کر سکتا ہوں۔ میں نے چھری کی دھار کو چھو کر دیکھا ہے مگر وہ چھری کسی کا گلا کیسے کاٹ سکتی ہے، میں نہیں جانتا۔ میں نے آگ کی گرمی کو محسوس کیا ہے۔ مگر وہ کسی کو جلا کر راکھ کا ڈھیر کیوں کر بنا دیتی ہے، مجھے نہیں معلوم۔ ہم اندھے دیکھ نہیں سکتے۔ مگر ہمارا احساس ہی ہماری بینائی ہے ہم اندھوں کا اپنا ایک تصور ہوتا ہے۔ ہم چیزوں کو چھو کر یا آوازوں کو سن کر اُن کی شکلیں ترتیب دے لیتے ہیں۔ اس لمحہ بہ لمحہ بڑھتے شور سے بھی میرے ذہن میں کئی تصویریں اُبھریں، بھیانک، ڈراونی اور بدہئیت۔ اُن تصاویر کے جو خدوخال میرے ذہن میں اُبھرے۔ ممکن ہے وہ آپ آنکھ والوں کے تصوّر سے مختلف ہوں۔ مجھے یوں محسوس ہوا، میں سچ مچ آوازوں کے جنگل میں کھڑا ہوں۔ ہر آواز دوسری آواز کو قطع کر رہی تھی۔ ہر چیخ دوسری چیخ کے سینے سے اُبھرتی ہوئی معلوم ہوتی تھی اور اُن سب پر بھاری وہ پُرہیبت نعرے تھے جو چاروں طرف سے بموں کے دھماکوں کی طرح برس رہے تھے۔ میں اس اندھیری خانقاہ میں پورے وجود کے ساتھ اُن آوازوں کو سن رہا تھا۔ اُس وقت میرے کان اس قدر حساس ہو گئے تھے کہ چیونٹی کے چلنے کی آواز بھی سُن سکتے تھے۔ مجھے خانقاہ کے باہر کچھ لوگ سرگوشیاں

کرتے سنائی دیے۔ مگر میں ان لوگوں کی باتیں صاف طور پر نہ سُن سکا۔ شہر سے آتے شور وغل کے سیلاب میں وہ سرگوشیاں تنکوں کی طرح بہہ گئیں۔ سرگوشیوں کے ختم ہونے کے فوراً بعد 'ہر ہر مہادیو' کے فلک شگاف نعرے کی آواز سنائی دی۔ جواب میں 'اللہ اکبر' کا نعرہ گونجا اور پھر دیر تک مارو، پکڑو، جانے نہ پائے، قسم کی آوازیں آتی رہیں۔ پھر دھیرے دھیرے یہ آوازیں بھی دُور سے آتے بے پناہ شور میں ڈوب گئیں۔ چند لمحے نہیں گزرے تھے کہ پھر قریب سے کچھ لوگوں کے دوڑنے کی آواز آئی۔ ساتھ ہی ایک نسوانی چیخ بھی اُبھری، "بچاؤ، بچاؤ، و، و، نہیں، نہیں"۔ اس "نہیں نہیں" کے ساتھ ہی کچھ وحشیانہ قہقہے گونجے اور ان قہقہوں کے بوجھ تلے وہ نسوانی چیخیں دب کر رہ گئیں، کچھ دیر بعد پھر ایک آواز سُنائی دی۔

"نہیں، نہیں مجھے ذبح مت کرو۔ میں تمھارے پانو پڑتا ہوں، ارے دیکھو مجھے ذبح ..... ع، ع، ع"

اس آواز کے ختم ہوتے ہی پھر ایک فلک شگاف نعرہ لگا اور پھر وہی وحشیانہ قہقہے۔ اس طرح پتا نہیں کب تک، آوازوں کا جنگل اُگتا اور کٹتا رہا۔ صدیاں بیت گئیں۔ مجھے لگا میں پتھر بن گیا ہوں اور وقت پنڈولم کے ٹھوکوں کی طرح میری پیشانی سے ٹکرا ٹکرا کر گزر رہا ہے اور میری پیشانی لہولہان ہو رہی ہے۔ میں دیکھ نہیں سکتا تھا مگر میں سمجھتا ہوں پوری زمین لہو سے سرخ ہو گئی ہوگی، پھر مجھے نہیں معلوم کتنا وقت بیتا۔ میں اسی طرح بے حس و حرکت بیٹھا اپنے پورے جسم پر اُن دہشت انگیز آوازوں کے وار سہتا رہا۔ تبھی اچانک میں نے محسوس کیا کہ اس اندھیری خانقاہ میں میرے علاوہ بھی کوئی اور ہے۔ شاید کوئی شکاری جو شکار کی تلاش میں ہو۔ نہیں شکاری نہیں۔ کوئی شکار جو شکاریوں

کے خوف سے یہاں آچھپا ہو ۔ تب ایک عرصے کے بعد میرے ہونٹ ہلے ۔
میں نے دھیرے سے پکارا ۔ "کون ہے ؟" کوئی جواب نہیں ملا ۔ میں نے ٹٹول کر اپنے سرہانے سے ماچس کی ڈبیا نکالی اور تیلی جلائی ۔ پھر بولا "دیکھو گھبراؤ نہیں ۔ میں اس خانقاہ کا اندھا بابا ہوں ۔ تم کون ہو، میرے پاس آؤ ۔"
مگر پھر بھی کوئی جواب نہیں ملا ۔ خانقاہ کے اندھیرے میں صرف میری آواز گونج کر رہ گئی ۔ تھوڑی دیر بعد میں نے سسکیوں کی آواز سنی ۔ کوئی دھیرے دھیرے رو رہا تھا ۔ میں نے آواز سے اندازہ لگایا کہ رونے والا نو دس برس کا لڑکا ہے اور خوف کے مارے وہ کھل کر رو بھی نہیں پا رہا تھا ۔ میں سمجھ گیا کہ وہ شکاری کتوں کے خوف سے یہاں آکر چھپا ہے ۔ پتا نہیں بے چارے کے والدین اور عزیزوں پر کیا بیتی ؟ میں کچھ دیر تک اس کی سسکیاں سنتا رہا ۔ پھر دھیرے سے بولا ۔
"دیکھو بیٹے یہاں میرے پاس آجاؤ ، یہاں کوئی نہیں آئے گا ۔"
مگر سسکیاں برابر گونجتی رہیں ۔ میں پھر بولا ۔ "دیکھو میں اندھا ہوں میں تمھیں دیکھ نہیں سکتا ۔ تم خود میرے پاس آجاؤ ۔ ڈرو نہیں ۔ یہاں میرے سوا دوسرا کوئی نہیں ۔"
سسکیاں دھیرے دھیرے تھم گئیں ۔ پھر مجھے یوں محسوس ہوا کہ وہ لڑکا اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا ہے اور اب دھیرے دھیرے میری طرف بڑھ رہا ہے ۔ میں نے اپنے لہجے کو اور بھی کومل بناتے ہوئے کہا ۔
"آؤ بیٹا آؤ ، ڈرو نہیں میں تو اس خانقاہ کا اندھا بابا ہوں ۔ آؤ میرے پاس بیٹھو ۔ یہاں کوئی تمھیں کچھ نہیں کہے گا ۔"
پیروں کی چاپ میرے بالکل قریب آکر رک گئی ۔ میں نے پھر پچکارتے

ہوئے کہا۔

"آؤ، آؤ یہاں میرے بستر پر بیٹھ جاؤ۔" مگر پیروں کی چاپ اسی جگہ رُکی رہی۔ کوئی جواب نہیں ملا۔ میں نے بے چین ہوتے ہوئے کہا۔

"بیٹھو بیٹا، کھڑے کیوں ہو؟"

تبھی ایک انتہائی خوف بھری تھرتھراتی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

"بابا آپ ہندو ہیں یا مسلمان؟"

میں بیان نہیں کر سکتا کہ اس سوال سے مجھ پر کیا بیتی؟ وہ سوال نہیں پگھلا ہوا سیسہ تھا جو میرے کانوں میں اُتر گیا۔ ایک جلتا ہوا تیر تھا جو سیدھے میرے دل میں پیوست ہو گیا میں گردن اُٹھائے منہ کھولے بیٹھا رہ گیا۔ مجھے لگا کہ اس چھوٹے سے سوال کے شکنجے میں میری گردن بُری طرح جکڑ گئی ہے اور میری آواز اپنے ہی حلق میں گھٹ کر مر گئی ہے۔ میرے سارے حواس ختم ہو گئے تھے۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے جادو کے زور سے مجھے ہوا میں معلّق کر دیا ہو۔ نہ میرے ہاتھ آسمان کو چھو سکتے تھے، نہ میرے پیر دھرتی پر لگ رہے تھے۔ آپ کو سوگند ہے، اب آپ دوبارہ مجھ سے میرا نام نہ پوچھیے۔ میرا کوئی نام نہیں ہے میرا کوئی دھرم بھی نہیں نہ میرا کوئی پنتھ ہے نہ مسلک، اُس دن میں اس لڑکے کے سوال کا جواب نہ دے سکا۔ وہ سوال آج بھی کسی ہزار پا کی طرح میرے وجود کو جکڑے ہوئے ہے مگر چھٹکارے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ میں اس سے چھٹکارا پائے بغیر آپ کے سوال کا جواب کیوں کر دے سکتا ہوں۔

●

سنہ ۱۹۷۳ء

انجام کار

آج شام کو آفس سے گھر لوٹتے وقت تک بھی میں نہیں سوچ سکتا تھا کہ حالات مجھے اس طرح بےبس کر کے رکھ دیں گے۔ میں چاہتا تو اس سانحے کو ٹال بھی سکتا تھا۔ مگر آدمی کے لیے ایسا کر سکنا ہمیشہ ممکن نہیں ہوتا۔ کچھ باتیں ہمارے چاہنے یا نہ چاہنے کی حدود سے پرے ہوتی ہیں اور شاید ایسے غیر متوقع سانحات ہی کو دوسرے الفاظ میں 'حادثہ' کہتے ہیں۔ جو بھی ہو۔ میں حالات کے غیر مرئی شکنجے میں جکڑا ہوا تھا۔ اور اب اس سے نجات کی کوئی صورت دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

آج گھر لوٹنے میں مجھے دیر ہو گئی تھی اس لیے میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا گھر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ مجھے بیوی کی پریشانی کا بھی خیال تھا۔ وہ یقیناً کھڑکی کی جھری سے آنکھ لگائے میری راہ دیکھ رہی ہوگی اور ذرا ذرا سی آہٹ پر چونک چونک پڑتی ہوگی۔ سانجھ کی پرچھائیاں گھر آئی تھیں۔ میں جیسے ہی گلی میں داخل ہوا

اس جانے پہچانے ماحول نے مجھے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ ٹین کی کھولیوں کے چھجوں سے نکلتا ہوا دھواں، اِدھر اُدھر بہتی نالیوں کی بدبو اور ادھ ننگے بھاگتے دوڑتے بچّوں کا شور، کتّوں کے پلّے، مرغیاں اور بطخیں۔ دو ایک کھولیوں سے عورتوں کی گالیاں بھی سُنائی دیں۔ جو شاید اپنے بچّوں یا پھر بچّوں کے بہانے پڑوسنوں کو دی جا رہی تھیں۔

میں جب اپنی کھولی کے سامنے پہنچا تو دیکھا کہ میرے دروازے کے سامنے گندے پانی کی نکاسی کے لیے جو نالی بنی تھی۔ اُس میں شامو دادا کا ایک چھوکرا دیسی شراب کی کچھ بوتلیں چھُپا رہا ہے۔ مجھے اپنے سر پر دیکھ کر پہلے تو وہ کچھ بوکھلایا پھر سنبھل کر قدرے مسکرا دیا۔ دیسی شراب کی بو میرے نتھنوں سے ٹکرا رہی تھی۔ میں نے ذرا تیز لہجے میں پوچھا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟"

وہ اطمینان سے مسکراتا ہوا بولا۔ "دادا نے یہ چھے بوتلیں یہاں چھپانے کو بولا ہے۔"

گلی کی گندگی جب تک گلی میں تھی تو کوئی بات نہیں تھی۔ مگر اب وہ گندگی میرے دروازے تک پھیل آئی تھی اور یہ بات کسی بھی شریف آدمی کے لیے ایک چیلنج تھا۔ لہٰذا میں چُپ نہ رہ سکا۔ میں نے اسی تیز لہجے میں کہا۔

"یہ بوتلیں یہاں سے ہٹاؤ۔ یہ گٹر تمھاری بوتلیں چھُپانے کے لیے نہیں بنی ہے۔"

لڑکا تھوڑی دیر تک مجھے گھورتا رہا۔ پھر بولا۔ "اپن کو نہیں معلوم، دادا نے یہاں چھُپانے کو بولا تھا۔"

"میں کچھ نہیں جانتا۔ چلو اُٹھاؤ یہاں سے۔"

لڑکے نے ہونٹوں ہی ہونٹوں میں کچھ بڑبڑاتے ہوئے بوتلیں واپس اپنے

میلے جھولے میں رکھ لیں۔ پھر جاتے جاتے مُڑ کر بولا۔ "ساب! جاستی (زیادہ) ہوساری دکھائے گا تو بھاری پڑے گا۔ یہ نہر ونگر ہے۔"

میں نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ اُس آوارہ چھوکرے کے مُنہ لگنا بے کار تھا۔ وہ بوتلیں لے کر چلا گیا یہی غنیمت تھا۔ میں اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ میں نے کنکھیوں سے دیکھا، میری اور لڑکے کی گفتگو سن کر اِرد گرد کی کھولیوں کے دروازے کھُلے اور کچھ عورتیں باہر جھانکتی ہوئی، دل چسپی اور تجسس سے میری طرف دیکھ رہی تھیں۔ میں نے اُس طرف زیادہ دھیان نہیں دیا اور اپنے کمرے کے دروازے پر پہنچ گیا۔ بیوی بھی شاید میری آواز سن چکی تھی۔ وہ دروازہ کھولے کھڑی تھی۔

"کیا ہوا؟ کون تھا؟" اُس نے قدرے گھبراہٹ کے ساتھ پوچھا۔ میں کمرے میں داخل ہو گیا۔ بیوی نے دروازے کے پٹ بھیڑ دیے۔

"کم بختوں کو دوسروں کی تکلیف یا عزّت کا ذرا خیال نہیں۔" میں جوتے کی لیس کھولتے ہوئے بڑبڑایا۔

"کیا ہوا؟" بیوی کا لہجہ گھبرایا ہوا ہی تھا۔

"ارے وہ شامو دادا کا چھوکرا، اپنے گھر کے سامنے والی نالی میں شراب کی بوتلیں چھپا رہا تھا۔"

بیوی تھوڑی دیر چُپ رہی پھر بولی "میں کہتی ہوں خدا کے لیے کوئی دوسری جگہ ڈھونڈ لیجیے۔ آج نل پر بیچھے نمبر والی آنٹی بھی خواہ مخواہ مجھ سے اُلجھ پڑی تھی۔"

میں نے بُش شرٹ کے بٹن کھولتے ہوئے پوچھا۔ "کیا ہوا تھا؟"

"ہوتا کیا، یہ لوگ تو جھگڑے کے لیے بہانہ تلاشتے رہتے ہیں۔ سب کو نمبر سے تین تین ہنڈے پانی ملتا ہے۔ میں نے صرف دو ہنڈے لیے تھے۔ وہ کہنے لگی تمھارے گھر میں زیادہ ممبر نہیں ہیں۔ تم صرف دو ہنڈے لو۔ میں نے کہا سب کو

تین ملتے ہیں تو میں بھی تین ہی لوں گی۔ دو کیوں لوں ؟ بس اسی پر بات بڑھ گئی۔"

میں کھاٹ پر لیٹ گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر کیا کیا جائے۔ ابھی تین چار ماہ تک کھولی بدلنے جیسی حالت میری تھی نہیں اور یہاں ایک ایک دن گزارنا مشکل ہوتا جارہا تھا۔ مجھے یہاں آئے ہوئے صرف تین مہینے ہوئے تھے۔ بیوی یہاں کے ماحول سے اس قدر پریشان ہوچکی تھی کہ روز رات کو سونے سے پہلے وہ اِدھر اُدھر کی باتوں کے درمیان گھر بدلنے کی بات ضرور کرتی۔ میں کبھی سمجھاکر، کبھی ڈانٹ کر اُسے ٹال دیتا۔ یہ بات نہیں تھی کہ وہ میری مالی حالت سے واقف نہیں تھی۔ مگر وہ بھی ایک عام گھریلو عورت کی طرح ایک اچھّے گھر کی خواہش کو اپنے دل سے کسی طرح بھی الگ نہیں کرسکتی تھی۔ اُس کی یہ خواہش اُس وقت مزید شدّت اختیار کرجاتی جب گلی میں کوئی لڑائی جھگڑا یا دنگا فساد ہوجاتا۔ اس قسم کے دنگے یہاں تقریباً روز ہی ہوا کرتے تھے۔ بعض اوقات تو معمولی جھگڑے سے بھی خون خرابے تک نوبت آجاتی۔ اتوار کے روز یہاں کے ہنگاموں میں خصوصیت سے اضافہ ہوجاتا۔ ہفتے کے چھے دن تو زیادہ تر عورتیں آپس میں لڑتی رہتیں۔ کبھی کبھی نل یا سنڈاس کی لائن میں دو چار عورتیں ایک دوسرے سے اُلجھ پڑتیں۔ جھونٹے پکڑ کر بھی کھینچے جاتے۔ مگر یہ جھگڑے گالی گلوج یا معمولی نوچ کھسوٹ سے آگے نہ بڑھ پاتے۔ مگر اتوار کا دن ہفتے بھر کے چھوٹے موٹے جھگڑوں کا فیصلہ کن دن ہوتا کیوں کہ اس دن ان عورتوں کے شوہروں بیٹوں اور دوسرے عزیز رشتے داروں کی چھٹی کا دن ہوتا جو موٹر ورک شاپوں، ملوں اور دیگر چھوٹے موٹے کارخانوں میں کام کرتے تھے۔ اُس دن شنکر پاٹل کا مٹکے کا کاروبار بھی کلوز رہتا۔ البتہ شامو دادا کے اڈّے پر خاص رونق ہوتی۔ صبح ہی سے پینے والوں کا تانتا بندھا رہتا۔ اور لوگ 'نوٹانک' 'پاؤ سیر' پی پی کر گلی میں اس سرے سے اس سرے تک لڑکھڑاتے۔ گالیاں دیتے اور ہنستے قہقہے لگاتے گھومتے رہتے۔

ہفتے بھر عورتیں اُنھیں اپنے چھوٹے چھوٹے جھگڑوں کی جو رپورٹیں دیتی رہتیں وہ انھیں رپورٹوں کی بنیاد پر کسی نہ کسی بہانے لڑائی چھیڑ دیتے۔ ہفتے بھر کا حساب چُکانے کے لیے مرد اپنے اپنے ٹین اور لکڑی کے ناپختہ جھونپڑوں سے نکل آتے۔ دن بھر خوب جم کر لڑائی ہوتی۔ دو چار کا سر پھٹتا اور دو چار کو پولیس پکڑ کر لے جاتی۔ یہ ہر اتوار کا معمول تھا۔

یہاں کے ماحول سے میں بھی کافی پریشان تھا۔ مگر صرف پریشانی سے کب کوئی مسئلہ حل ہوتا ہے۔ شہروں میں ایک صاف ستھرے ماحول میں، مناسب مکان کا حاصل کرنا مجھ جیسے معمولی کلرک کے لیے کتنا مشکل ہے۔ اس کا صحیح اندازہ بیوی کو نہیں ہو سکتا تھا۔ کیوں کہ وہ گاؤں سے پہلی دفعہ شہر آئی تھی۔

اتنے میں بیوی چائے کا پیالہ لے کر ساڑی کے پلّو سے مُنہ پونچھتی میرے پاس آکر بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر تک خاموش نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی۔ پھر بولی "لیجیے چائے پی لیجیے۔"

میں نے چائے کا پیالہ اُٹھا لیا۔ وہ کہہ رہی تھی۔

"پرسوں تین نمبر والی زلیخا آئی تھی۔ اُس نے مجھ سے اُدھار آٹا مانگا۔ میں نے بہانہ کر دیا کہ گیہوں ابھی پسائے نہیں گئے ہیں۔ اُس وقت وہ چُپ چاپ چلی گئی۔ مگر تب سے سنڈاس کی لائن میں، نل پر مجھے دیکھتے ہی ناک چڑھا کر آنکھیں مچکاتی ہے اور میری طرف مُنہ کر کے تھوکتی ہے۔ کتیا کہیں کی۔"

بیوی نے منہ بناتے ہوئے تلخ لہجے میں کہا۔ میری نظریں بیوی کے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں۔ میں نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔ "تھوڑا سا آٹا دے دینا تھا"

"کیا دے دیتی؟" اُس کی آواز مزید تیکھی ہو گئی۔ "آپ نہیں جانتے۔ ان لوگوں کی نہ دوستی اچھی، نہ دشمنی۔ اسی لین دین پر سے تو آئے دن یہاں جھگڑے ہوتے

رہتے ہیں۔" بیوی نے جیسے کسی بہت بڑے راز کا انکشاف کرنے والے انداز میں کہا۔
میں چپ تھا۔ وہ کہہ رہی تھی۔

"آج آپ نے دیر کر دی۔ خدا کے لیے آپ آفس سے جلد آیا کیجیے۔ آپ کے آفس سے لوٹنے تک میری جان سوکھتی رہتی ہے۔ یہاں پل، پل ایک جھگڑا ہوتا رہتا ہے۔ آپ کے لوٹنے سے پہلے سامنے والی سکینہ اور رابو میں خوب گالی گلوج ہوئی۔"

"کیوں ؟"

"کچھ نہیں، سکینہ کے بچے نے رابو کی بطخ کو کنکر مارا تھا۔ بس اُسی پر دونوں میں خوب جم کر لڑائی ہوئی وہ تو سکھو تائی نے دونوں کو سمجھا بجھا کر چپ کرایا، ورنہ نوچ کھسوٹ تک کی نوبت آگئی تھی۔"

میں سننے کو تو بیوی کی باتیں سن رہا تھا۔ مگر میرا ذہن شامو دادا کے چھوکرے کے ساتھ ہوئی گفتگو میں اُلجھا ہوا تھا۔ کم بخت ایک تو غلط کام کرتے ہیں اور ٹوکو تو دھمکیاں دیتے ہیں۔ دادا ہے نا۔ قانون قاعدہ سب اُن کا غلام ہے۔ جس دن قانون کی گرفت میں آجائیں گے ساری دادا گری دھری کی دھری رہ جائے گی۔
اچانک بیوی بولتے بولتے چپ ہوگئی۔ وہ کچھ سننے کی کوشش کر رہی تھی۔ آوازیں میرے دروازے پر آکر رک گئیں۔ میں نے شامو دادا کی آواز سنی وہ کہہ رہا تھا۔

"چل بے لانو! رکھ اس میں بوتلیں۔ دیکھتا ہوں کون سالا روکتا ہے۔"

ایک لمحے کو میرا دل زور سے دھڑکا۔ آخر وہی ہوا جس سے میں اب تک بچتا آیا تھا۔ میں نے بیوی کی طرف دیکھا۔ اُس کا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا۔ اُس نے میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

"جانے دیجیے، رکھ لینے دیجیے۔ اپنا کیا جاتا ہے۔"

پیالے میں تھوڑی سی چائے بچی تھی۔ میں نے پیالہ اُسی طرح فرش پر رکھ دیا۔

پھر اس سے اپنا ہاتھ دھیرے سے چھڑاتا ہوا بولا۔
"تم چپ بیٹھی رہو۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ ہم اس طرح ان کی ہر بات برداشت کریں گے تو یہ لوگ ہمارے سر پر سوار ہو جائیں گے۔" میں کھاٹ پر سے اٹھ گیا۔
بیوی گھگیائی۔ "نہیں خدا کے لیے آپ باہر مت جائیے۔ آپ اکیلے کیا کر سکیں گے۔ وہ بدمعاش لوگ ہیں۔"
میں نے اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "پاگل ہوئی ہو۔ میں کیا جھگڑا کرنے جا رہا ہوں۔ آخر بات کرنے میں کیا حرج ہے۔"
میں دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔ شامو دادا کمر پر دونوں ہاتھ رکھے کھڑا تھا۔ اُس کے پاس اور دو چھوکرے جیبوں میں ہاتھ ڈالے کھڑے تھے۔ وہی چھوکرا جو پہلے بھی آیا تھا۔ جھولے سے بوتلیں نکال نکال کر گٹر میں دبا رہا تھا۔ میرے باہر نکلتے ہی وہ چاروں میری طرف دیکھنے لگے۔ شامو ایک لمحے تک مجھے گھورتا رہا۔ پھر چھوکرے سے مخاطب ہوا۔
"اے سالے! سنبھال کر رکھ، کوئی بوتل پھوٹ ووٹ گئی تو تیری بہن کی... ایسی تیسی کر ڈالوں گا۔"
میں اپنے چبوترے کے کنارے پر آ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ لوگ میری طرف مڑے۔ اُن کی آنکھوں میں غصّہ، نفرت اور حقارت کے بھاو اُتر آئے۔ میں نے قریب پہنچ کر نہایت نرم لہجے میں شامو سے کہا۔
"آپ ہی شامو دادا ہیں؟"
"ہاں کیوں؟" شامو کسی کٹکھنے کتّے کی طرح غرّایا۔
"دیکھیے یہاں ان بوتلوں کو مت رکھیے ہمیں تکلیف ہوگی۔"
"تکلیف ہوگی تو کوئی دوسری جگہ ڈھونڈو۔ اس جھونپڑپٹی میں کیوں چلے آئے۔

"میری بات سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ یہ چیزیں ہمیں پسند نہیں ہیں۔ کسی دوسری جگہ کیوں نہیں رکھتے انھیں۔"

"یہ بوتلیں یہیں رہیں گی، تمھیں جو کرنا ہے کر لو۔"

اُس کے باقی دونوں ساتھی میری طرف بڑھتے ہوئے بولے۔ "یہ تمھارے باپ کی گڑھ ہے کیا؟"

اُس وقت اندر ہی اندر اُبلتے غصّے کی وجہ سے میری جو حالت ہو رہی تھی وہ بیان سے باہر ہے۔ جی میں آرہا تھا کہ ان تینوں کم بختوں کی ایک سرے سے لاشیں گرادوں۔ مگر میں جانتا تھا کہ ایسی جگہوں پر اپنا ذہنی توازن کھونے کا مطلب سوائے پٹنے کے اور کچھ بھی نہیں۔ میں نے لہجے کو ذرا بھاری بناتے ہوئے کہا۔

"دیکھو باپ دادا کا نام لینے کی ضرورت نہیں۔ میں اب تک شرافت سے آپ لوگوں کو سمجھا رہا ہوں۔"

"ارے تو تو کیا کرے گا ہمارا۔ تیری ماں کی .... مادر .... سالا۔ ایک جھاپڑ میں مٹی چاٹنے لگے گا اور ہم سے ہوشیاری کرتا ہے۔" شامو نے دو قدم میری طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

گالی سُن کر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ میں نے اُنگلی اُٹھا کر کہا۔ "دیکھو شامو! اپنی حد سے آگے مت بڑھو۔ ایک تو غیر قانونی کام کرتے ہو اُوپر سے سینہ زوری کرتے ہو۔"

"ارے تیرے قانون کی بھی ماں کی ...." شامو میری طرف لپکتا ہوا بولا۔ اُس کے ایک ساتھی نے اُسے پیچھے ہٹاتے ہوئے کہا۔ "ٹھہرو دادا، اس سالے کو میں ٹھیک کرتا ہوں۔"

اس نے جیب سے ایک لمبا سا چاقو نکال لیا۔ کڑ، ڑ، کڑ، ڑ، کڑ، ڑ چاقو

کھلنے کی آواز کے ساتھ ہی میرے جسم میں سر سے پیر تک چیونٹیاں رینگ گئیں۔ میری انتہائی کوشش کے باوجود حالات میرے قابو سے باہر ہو چکے تھے۔ ایک لمحے کو میں سر سے پیر تک، کانپ گیا۔ اِرد گرد کے جھونپڑوں سے عورتیں، مرد اور بوڑھے سب نکل آئے تھے۔ سب کے سب اس جھگڑے کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ شامو کے ساتھی کے چاقو نکلتے ہی دو تین عورتوں کے مُنہ سے چیخیں نکل گئیں اور ان چیخوں نے میری نس نس میں ایک کپکپاہٹ سی بھر دی۔ میں زندگی میں پہلی دفعہ اس قسم کی سچویشن سے دوچار ہوا تھا۔ میرا سارا غصّہ ایک خوف زدہ بچّے کی طرح سہم کر میرے اندر ہی دُبک گیا۔ میں اب صرف ایک گھبراہٹ بھرے پچھتاوے کے ساتھ اُس غنڈے کے چمچماتے چاقو کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں اُس وقت بھاگ کر اپنے کمرے میں چھُپ سکتا تھا۔ مگر اب بھاگنا بھی اتنا آسان نہیں رہ گیا تھا۔ کیوں کہ بیسیوں آنکھیں مجھے اپنی نظر کے ترازو میں تول رہی تھیں۔ بھاگنے کا مطلب تھا میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اُن نگاہوں میں مر جاتا۔

وہ غنڈا چاقو لیے میری طرف بڑھا اور میں بے حس و حرکت وہیں کھڑا رہا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اس وقت میں بہت بہادری سے کھڑا تھا۔ بل کہ اُس وقت اپنے پیروں کو اس جگہ جمائے رکھنے میں مجھے جس کش مکش اور تکلیف کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا وہ میرا ہی دل جانتا ہے۔ میں اپنے کمرے کے چبوترے پر کھڑا تھا۔ وہ غنڈا بالکل میرے قریب پہنچ چکا تھا۔ قریب پہنچ کر وہ بھی ایک لمحے کو ٹھٹکا۔ شاید اُسے بھی توقع تھی تھی کہ میں بھاگ کر کمرے میں گھس جاؤں گا۔ مگر جب خلافِ توقع اُس نے مجھے اسی طرح کھڑا پایا تو بجائے مجھ پر چاقو کا وار کرنے کے میری ٹانگ پکڑ کر مجھے نیچے کھینچ لینا چاہا۔ میں ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ میری ٹانگ اُس کے ہاتھ نہ آسکی۔ اتنے میں پیچھے سے ایک چیخ سُنائی دی اور کوئی آکر مجھ سے لپٹ گیا۔ میں نے پلٹ کر

دیکھا۔ میری بیوی میری کمر پکڑے مجھے اندر کھینچنے کی کوشش کرنے لگی۔ وہ بُری طرح رو رہی تھی۔

"چلیے آپ اندر چلیے۔ خدا کے لیے آپ اندر چلیے۔" اُس نے مجھے کمرے کی طرف گھسیٹتے ہوئے کہا۔ بیوی میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ وہ مجھے اندر گھسیٹ لے جاتی۔ مگر میرا لاشعور بھی شاید اسی میں اپنی عافیت سمجھ رہا تھا۔ بیوی نے مجھے کمرے میں دھکیل کر دروازہ اندر سے بند کر لیا اور زور زور سے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ایک لمحے تک باہر سنّاٹا چھایا رہا۔ صرف میری بیوی کی زور زور سے رونے کی آواز سُنائی دے رہی تھی۔ پھر باہر سے مغلظات کا ایک طوفان اُمڈ پڑا۔ وہ سب مجھے بے تحاشا گالیاں دے رہے تھے۔ پھر ایسا بھی سُنائی دیا جیسے کچھ لوگ انھیں سمجھا رہے ہوں۔ مگر دو تین منٹ تک گالیوں کا سلسلہ برابر چلتا رہا۔ بیوی دونوں پیر پکڑے میرے گھٹنوں پر سر ٹکائے بُری طرح رو رہی تھی۔ میں کھاٹ پر کسی بُت کی طرح چُپ چاپ بیٹھا رہا۔ آخر مغلظات کا طوفان رُکا اور پھر ایسا لگنے لگا جیسے بھیڑ چھٹ رہی ہو۔ تھوڑی دیر بعد باہر مکمل سنّاٹا چھا گیا۔ صرف رہ رہ کر کسی کھولی سے کسی عورت کی کوئی تیکھی گالی اُڑتی ہوئی آتی اور ایک طمانچے کی طرح کان پر لگتی۔ میں پتا نہیں کتنی دیر تک اسی طرح چپ چاپ بیٹھا رہا۔ بیوی پتا نہیں کب تک گود میں سر ڈالے روتی رہی۔ اُس وقت ندامت، غصّہ اور خوف سے میری عجیب کیفیت تھی۔ ذہن گویا ہوا میں اُڑا جا رہا تھا اور دل تھا کہ سینے میں سنبھلتا ہی نہیں تھا۔ میری ساری کوششوں کے باوجود معاملہ کسی کانچ کے برتن کی طرح میرے ہاتھوں سے چھوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا تھا اور اب اُس کی کرچیں میرے جسم میں اس طرح گڑ گئی تھیں کہ میرا سارا وجود لہولہان ہو گیا تھا۔ میری ساری تدبیریں ناکام ہو گئی تھیں اور اب میں بہت بلندی سے گرنے والے کسی بدنصیب شخص کی طرح ہوا میں معلق ہاتھ پیر مار رہا

تھا۔ کسی کنگار کو چھو سکنے یا کسی ٹھوس جگہ پر پانو جمانے کی بے نتیجہ کوشش ... آخر میں نے طے کر لیا کہ میں جلد ہی یہ کھولی چھوڑ دوں گا۔ مگر کھولی چھوڑنے سے پہلے اپنی توہین کا بدلا بھی لینا تھا۔ مگر میں اکیلا کیا کر سکتا تھا۔ میں بہت دیر تک اسی پیچ و تاب میں بیٹھا رہا۔ آج میں اپنی نظروں میں ذلیل ہو گیا تھا۔ رہ رہ کر اُن غنڈوں کی گالیاں میرے کانوں میں گونج رہی تھیں اور میری بے بسی کا احساس بڑھتا جا رہا تھا اور اس بے بسی کے احساس کے ساتھ ہی میرا غصّہ بھی بڑھتا جا رہا تھا۔ بیوی کی سسکیاں اب تھم چکی تھیں مگر اس کا سر میری گود میں اسی طرح رکھا تھا۔ میں نے آہستہ سے اُس کا سر اُٹھاتے ہوئے کہا۔

"اٹھو چارپائی پر لیٹ جاؤ۔"

بیوی اُسی طرح فرش پر بیٹھی ساڑی کے پلّو سے اپنی ناک سڑکنے لگی۔ میں اُٹھ کر بُش شرٹ پہننے لگا۔ بیوی نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا "کہاں جا رہے ہو؟"

میں نے کہا۔ "تم آرام کرو۔ میں ابھی پولیس اسٹیشن سے ہو آتا ہوں۔"

"نہیں آپ کہیں نہ جائیے۔"

"گھبراؤ نہیں۔" میں نے تسلّی دیتے ہوئے کہا۔ "میں ابھی دس منٹ میں آجاؤں گا۔"

"نہیں خدا کے لیے آپ اُن لوگوں سے نہ اُلجھیے۔ وہ لوگ بہت بدمعاش ہیں۔"

"تم خواہ مخواہ گھبرا رہی ہو۔ یہ لوگ سیدھے سادے لوگوں پر اسی طرح دھونس جماتے ہیں۔ کسی کو مارنا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ تم دیکھنا دس منٹ بعد پولیس ان سب کے ہتکڑیاں لگا کے لے جائے گی۔ کسی شریف آدمی کو اس طرح پریشان کرنا ہنسی کھیل نہیں ہے۔"

"مگر آپ اکیلے ہیں اور وہ بہت سارے ہیں۔ آپ اکیلے کتنوں سے لڑیں گے۔"

"ارے میں لڑنے کہاں جارہا ہوں۔ پولیس میں شکایت درج کراؤں گا۔ پولیس خود ان کر اُن سے سمجھے گی۔ ہم اس طرح اُن کی بدمعاشی کو سہتے رہیں تو جینا دوبھر ہو جائے گا۔ اُنھیں اُن کی بدمعاشی کی آخر کچھ تو سزا ملنی چاہیے۔"

بیوی کی آنکھوں سے پھر آنسو بہنے لگے۔ "جب ہمیں یہاں رہنا ہی نہیں ہے تو پھر خواہ مخواہ اُن کے مُنہ لگنے کی کیا ضرورت۔"

میں نے ذرا کڑے لہجے میں کہا۔ "تم اندر سے کُنڈی لگا لو۔ تم ان باتوں کو نہیں سمجھتیں۔ وہ لوگ ہمارے دروازے پر آکر ہمیں یوں ذلیل کر جائیں اور ہم پولیس میں شکایت تک نہ کریں۔ اس سے بڑی بُزدلی اور کیا ہو سکتی ہے۔ آج انھوں نے دروازے پر گڑبڑ کی، کل گھر میں بھی گھُس سکتے ہیں۔"

پھر لہجے کو تھوڑا نرم بناتے ہوئے بولا۔ "تم سمجھ دار ہو۔ ہمت سے کام لو۔ میں ابھی لوٹ آؤں گا۔ چلو اٹھو دروازہ اندر سے بند کرو۔"

یہ کہہ کر میں باہر نکل گیا۔ بیوی مرے قدموں سے چلتی میرے پیچھے آئی۔ میں نے دروازہ بند ہونے کے ساتھ ہی اُس کی ہلکی ہلکی سسکیوں کی آواز بھی سُنی۔ گلی میں کافی اندھیرا تھا۔ پاس کی کھولیوں کے دروازے بند ہو چکے تھے۔ چاروں طرف ایک ناگوار قسم کا سنّاٹا چھایا ہوا تھا۔ میں گلی کو پار کر کے سڑک کے کنارے آگیا۔ یہاں لیمپ پوسٹ کی ملگجی روشنی اونگھ رہی تھی۔ میں نے مڑ کر دائیں طرف نظر دوڑائی جہاں شامو کا شراب کا اڈّا تھا۔ چاروں طرف ٹاٹ سے گھرے اُس اڈّے میں کافی روشنی ہو رہی تھی۔ باہر بنچوں پر کچھ لوگ بیٹھے پیتے دکھائی دیے۔ پاس ہی سیخ کباب والا اپنی انگیٹھی دہکائے بیٹھا تھا۔ اڈّے سے رہ رہ کر ہلکے ہلکے قہقہوں اور گلاسوں کے کھنکنے کی مِلی جُلی آوازیں آرہی تھیں۔ پولیس اسٹیشن جانے کا راستہ اُسی طرف سے تھا۔ مگر میں اُس طرف جانے کے بجائے دوسری طرف مڑ گیا اور

ریل کی پٹڑی کراس کر کے بڑی سڑک پر نکل آیا۔ میں دل ہی دل میں پولیس اسٹیشن میں انسپکٹر کے سامنے کی جانے والی شکایت کا خاکا ترتیب دینے لگا۔ میں زندگی میں پہلی دفعہ پولیس اسٹیشن جا رہا تھا۔ دل میں ایک طرح کی گھبراہٹ بھی تھی۔ مگر ان بدمعاشوں کو مزہ چکھانے کا جذبہ اُس گھبراہٹ پر کچھ ایسا حاوی تھا کہ پیر پولیس اسٹیشن کی طرف بڑھتے ہی گئے۔ میں نے سُن رکھا تھا کہ وہاں شریف آدمیوں سے کوئی سیدھے مُنہ بات تک نہیں کرتا۔ میں ذہن میں ایسے جملوں کو ترتیب دینے لگا جن کے ذریعے پولیس انچارج کے سامنے اپنی بے بسی اور پریشانی کا واضح نقشا کھینچ سکوں اور وہ فوراً متاثر ہو جائے۔ پولیس اسٹیشن کی عمارت آ گئی تھی۔ گیٹ میں داخل ہوتے وقت ایک بار پھر میرا دل زور سے دھڑکا۔

میں عمارت کی سیڑھیاں چڑھ کر وراندے میں پہنچا۔ پاس ہی بچھی بینچ پر ایک کانسٹبل بیٹھا ہتیلی پر تمباکو اور چونا مسلتا نظر آیا۔ اُس نے اپنی ٹوپی اتار کر بینچ پر رکھ لی تھی اور اس کی گنجی کھوپڑی بلب کی روشنی میں چمک رہی تھی۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی اُس نے استفہامیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں اُس کے قریب پہنچ کر ایک وقفے کے لیے رُکا۔ پھر بولا "مجھے ایک کمپلین لکھوانی ہے۔"

"کہاں سے آئے ہو؟" اُس نے تیوری چڑھا کر پوچھا۔

"نہرو نگر سے"

"کیا ہوا؟" اُس کی نظریں سر سے پیر تک میرا جائزہ لے رہی تھیں۔

"وہاں کچھ غنڈوں نے مجھ پر حملہ کرنا چاہا تھا۔"

"ہُم" اُس نے تمباکو کو اپنے نچلے ہونٹ کے نیچے دباتے ہوئے زور سے ہنکاری بھری۔ پھر ہاتھ جھاڑتا ہوا بولا۔ "جاؤ، اُدھر جاؤ" اُس نے سیدھے ہاتھ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ میں اُس طرف

مڑ گیا جدھر کانسٹبل نے اشارہ کیا تھا۔ کچھ قدم چلنے کے بعد ایک کھلا دروازہ دکھائی دیا۔ میں دروازے میں ٹھٹک گیا اور سامنے کرسی پر بیٹھے ایک موٹے حوالدار کو دیکھنے لگا۔ وہ شاید ہیڈ کانسٹبل تھا اور گردن جھکائے ہوئے کوئی فائل اُلٹ پلٹ رہا تھا۔ پاس ہی ایک دوسری میز پر کوئی کلرک کچھ ٹائپ کر رہا تھا اور ایک دوسرا کانسٹبل ایک طرف کرسی پر بیٹھا جماہیاں لے رہا تھا۔ میں نے ایک لمحے توقف کے بعد کھنکار کر کہا۔ "مے آئی، کم اِن؟" ہیڈ کانسٹبل نے فائل سے گردن اُٹھائی اور جماہی لینے والا کانسٹبل چندھیائی آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگا۔ ہیڈ کانسٹبل نے گردن ہلا کر مجھے اندر آنے کی اجازت دی۔ میں اندر داخل ہوا اور میز کے پاس جا کھڑا ہوا۔

"کیا ہے؟" ہیڈ کانسٹبل نے فائل پر سے نظریں اُٹھاتے ہوئے پوچھا۔

"جی.... جی... مجھے ایک کمپلین لکھوانی ہے۔"

"کہاں رہتے ہو؟"

"نہرو نگر میں۔"

"کیا ہوا، جلدی بولو۔" اُس کا لہجہ بڑا اہانت آمیز تھا۔

میں نے دل میں الفاظ تولتے ہوئے کہا۔ "جی بات یہ ہے کہ میں نہرو نگر میں پانچ نمبر بلاک میں رہتا ہوں۔ وہاں شامو دادا کا شراب کا اڈہ ہے۔ اُس کے چھوکروں نے آج مجھ پر چاقو سے حملہ کرنا چاہا تھا۔"

"کیوں، تم نے اُسے چھیڑا ہوگا۔" ہیڈ کانسٹبل نے کہا۔

میں اس ریمارک پر بوکھلا گیا۔ میں سمجھ رہا تھا شراب کے اڈے کا ذکر آتے ہی یہ لوگ اُن غنڈوں کی غنڈا گردی کو سمجھ جائیں گے۔ کیوں کہ شامو ناجائز شراب کا کاروبار کرتا تھا۔ مگر اب حوالدار کے تیور دیکھ کر میرا دل ڈوبنے لگا۔ میں نے مسمسی صورت بنا کر کہا۔ "جی میں نے کچھ نہیں کیا۔"

"پھر کیا اس کا دماغ خراب ہوگیا تھا جو خواہ مخواہ تم سے جھگڑا کرنے آگیا۔" اُس کے درشت لہجے نے میرے رہے سہے حواس بھی غائب کر دیے تھے۔ پھر بھی میں نے سنبھلتے ہوئے کہا۔

"جی بات یہ تھی کہ وہ ہمارے گھر کے سامنے والی نالی میں شراب کی بوتلیں چھپا رہا تھا۔ میں نے منع کیا۔ بس اسی پر بگڑ گیا۔"

"ہم، یہ بات ہے۔ یہ بتاؤ تم نے منع کیوں کیا؟"

"جی!" میں حیرت سے اُس کی طرف دیکھنے لگا۔ "صاحب وہ میرے گھر کے سامنے شراب چھپا رہا تھا۔ میں ایک شریف آدمی ہوں۔ کیا مجھے اس پر اعتراض کرنے کا حق بھی نہیں۔"

ہیڈ کانسٹبل نے ایک بار مجھے گھور کر دیکھا اور بولا۔ "ارے شراب کی بوتلیں نالی میں چھپا رہا تھا نا، تمھارا کیا بگڑتا تھا اس سے۔"

مجھے اب سچ مچ غصہ آگیا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں اس موٹے حولدار کو ایک موٹی سی گالی دی مگر بہ ظاہر اپنے لہجے کو حتی الامکان نرم بناتے ہوئے کہا۔

"مگر حولدار صاحب (حرامی صاحب) وہ غنڈا آدمی ہے۔ اگر میں اُس وقت اعتراض نہ کرتا تو وہ کل میرے گھر میں گھس سکتا تھا اور پھر اُس کا دھندا بھی تو قانوناً ناجائز ہے۔"

"بس بس ہم کو معلوم ہے۔ یہاں قانون مت بگھارو۔ اُدھر جاؤ پہلے صاحب سے شکایت کرو۔ وہ کہے گا تو ہم کمپلین لکھ لے گا۔" اُس نے بائیں طرف ایک کیبن کے بند دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ پھر وہ کرسی میں بڑے جماہی لیتے سپاہی سے مخاطب ہوا۔ "بھلے راو اس آدمی کو صاحب کے پاس لے جاؤ۔"

بھلے راو نے ایک بار پھر مُنہ پھاڑ کر جماہی لی اور کچھ بڑبڑاتا ہوا ناگواری

سے بولا۔ "چلو!"

وہ کرسی سے اُٹھا اور لڑکھڑاتے قدموں سے چلتا ہوا کیبن کی چق ہٹا کر اندر چلا گیا۔ پھر چند سیکنڈ بعد ہی باہر نکلا اور میری طرف دیکھے بغیر بولا۔ "جاؤ۔" اور خود دوبارہ اُسی کرسی کی طرف مڑ گیا جہاں پہلے بیٹھا جماہیاں لے رہا تھا۔ میں چق ہٹا کر اندر داخل ہوا۔ سامنے ایک سخت چہرے اور بڑی بڑی مونچھوں والا شخص مجھے گھور رہا تھا۔ میں نے تھوک نگلتے ہوئے دونوں ہاتھ جوڑ کر اُسے نمسکار کیا اور اس کے سامنے جا کھڑا ہوا (میرے دونوں ہاتھ نمسکار کی شکل میں اب بھی جُڑے ہوئے تھے) سامنے دو خالی کرسیاں پڑی تھیں۔ مگر میں اس قدر نروس ہو گیا تھا کہ کرسی پر بیٹھنے کے بجائے، میز کے کونے سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔

"کیا بات ہے؟" اُس سخت چہرے والے پولیس انسپکٹر نے (ہاں وہ صورت سے پولیس انسپکٹر ہی لگتا تھا) اپنی موٹی آواز میں پوچھا۔

میں نے پھر اپنے خشک ہوتے گلے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "صاحب میں ایک کمپلین لکھوانے آیا ہوں۔"

"کہاں رہتے ہو؟" اُس نے بھی مجھے سر سے پانو تک گھورتے ہوئے پوچھا۔

"نہرو نگر میں" میں نے انتہائی نرم اور ملتجی آواز میں جواب دیا۔

"بیٹھو۔" اُس نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور شام کے جھگڑے کی تفصیلات سنانے لگا۔ میری گفتگو کے دوران وہ سگریٹ سُلگا کر ہلکے ہلکے کش لیتا رہا۔ وہ میری باتیں اتنی بے دلی سے سن رہا تھا جیسے کوئی گھسا پٹا ریکارڈ سن رہا ہو۔ بس وہ سُننے کے لیے سن رہا تھا۔ جب میں چُپ ہوا تو ایک لمحے کو اس کی تیز نگاہیں میرے چہرے پر جمی رہیں۔ پھر اُس کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

"اچھا تو اب تم کیا چاہتے ہو؟"

"جی!" میں اُس کے سوال کا مطلب نہیں سمجھ سکا تھا۔ اس لیے صرف جی کر کے رہ گیا۔ انسپکٹر نے شاید میرے لہجے میں چھپے استعجاب کو بھانپ لیا تھا۔ اُس نے فوراً دوسرا سوال کیا۔

"کیا کام کرتے ہو؟"

"جی صاحب میں 'سی' وارڈ میں کلرک ہوں۔"

"گھر میں کون کون ہے؟"

"جی میں اور میری بیوی۔"

"شاید نئے آئے ہو۔"

"جی ہاں، چھ سات مہینے ہوئے ہیں۔"

"اچھا دیکھو واقعی تمھارے ساتھ زیادتی ہوئی ہے اور مجھے اس کا بڑا افسوس ہے مگر....."

انسپکٹر کے ان جملوں سے میری ڈھارس بندھی اور میرا حوصلہ بھی بڑھا۔ میں نے درمیان میں جلدی سے کہا۔ "سر! اگر آپ چاہیں تو......"

انسپکٹر کو شاید میرا اس طرح درمیان میں ٹوکنا بُرا لگا۔ اُس نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔

"پہلے ہماری پوری بات سُنو!"

"جی سر!" میں سہم کر ایک دم سے چُپ ہو گیا۔

"دیکھو! ہم ابھی تمھارے ساتھ دو چار سپاہی روانہ کر سکتے ہیں اور ساتھ ہی اُس کے آدمیوں کی مشکیں کسوا کر یہاں بُلا سکتے ہیں۔ مگر سوچو اس سے کیا ہو گا۔ وہ دوسرے ہی دن ضمانت پر چھوٹ جائے گا اور پھر تمھیں وہیں رہنا ہے اور وہ

ہے غنڈا آدمی۔ چھوٹنے کے بعد وہ انتقاماً کچھ بھی کرسکتا ہے۔ کیا تم میں اتنی طاقت ہے کہ اس سے ٹکرا سکو؟"

"مگر سر! قانون ...."

اُس نے ہاتھ اُٹھا کر مجھے چُپ کرا دیا اور سگریٹ کی راکھ ایش ٹرے میں جھاڑتا ہوا بولا۔

"قانون کی بات مت کرو۔ قانون ہم کو بھی معلوم ہے۔ پولیس تمھاری کمپلین پر ایکشن لے سکتی ہے۔ مگر چوبیس گھنٹے تمھاری حفاظت کی گارنٹی نہیں دے سکتی۔"

میں گردن جھکائے چُپ چاپ بیٹھا رہا۔ انسپکٹر نے دوسری سگریٹ سُلگاتے ہوئے کہا۔

"دیکھو! تم سیدھے سادے آدمی معلوم ہوتے ہو۔ ہوسکے تو وہ جگہ چھوڑ دو، اور اگر وہیں رہنا چاہتے ہو تو پھر ان غنڈوں سے مل کر رہو۔"

"مگر سر! وہ ناجائز شراب کا دھندا کرتا ہے کیا پولیس اُس کا دھندا بند نہیں کرا سکتی (مجھے فوراً احساس ہوا کہ مجھے یہ سوال نہیں پوچھنا چاہیے تھا) ایک پل کے لیے انسپکٹر کی آنکھوں میں غصّہ اتر آیا۔ اُس نے مجھے گھور کر دیکھا۔ پھر گمبھیر آواز میں بولا "پولیس خوب جانتی ہے کہ اسے کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں۔ شامو کا دھندا بند ہونے سے سارے کالے دھندے بند ہو جائیں گے ایسا نہیں ہے۔"

جی میں آیا کہہ دوں۔ کالے دھندے تو بند نہیں ہوں گے۔ مگر شامو سے ملنے والا ہفتہ ضرور بند ہو جائے گا اور تم یہی نہیں چاہتے۔ مگر ایسا کچھ کہنا اپنے آپ کو اندھے کنوئیں میں گرانے جیسا ہی تھا۔ کیوں کہ اگر یہ سامنے بیٹھا ہوا انسپکٹر ناراض ہو جائے تو اُلٹا مجھے اندر کرا سکتا ہے۔ میں نے کتنی ہی دفعہ شامو کے اڈے پر پولیس والوں کو کوکا کولا پیتے اور سیخ کباب اُڑاتے دیکھا تھا۔ ایک دو دفعہ تو وہ باہر بیٹھا

ہوا ہیڈ کانسٹبل بھی دکھائی دیا تھا۔ یہ میری ہی بھول تھی کہ میں یہاں دوڑا چلا آیا تھا۔
مجھے سچ مچ یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ ان حرام خوروں سے منصفی کی توقع رکھنا،
کنجوس سے سخاوت کی امید رکھنے جیسا ہی تھا۔ مجھے یوں گم سُم بیٹھا دیکھ کر انسپکٹر
نے سگریٹ کو ایش ٹرے میں رگڑتے ہوئے کہا۔

"دیکھو! اب بھی تم کمپلین لکھوانا چاہتے ہو تو باہر جا کر کمپلین لکھوا دینا۔
ایک کانسٹبل تمھارے ساتھ آئے گا اور شامو کو یہاں بُلا لائے گا۔ اب تم جا سکتے ہو۔"
اتنا کہہ کر اُس نے میز پر رکھی گھنٹی بجائی۔ جھٹ ایک حوالدار اندر داخل ہوا۔ انسپکٹر نے
رعب دار آواز میں کہا۔

"دیکھو یہ کوئی کمپلین لاج کرنا چاہتے ہیں۔ پانڈے سے کہو ان کی کمپلین لکھ لے
اور بھالے راؤ کو ان کے ساتھ بھیج دے۔"

"یس ۔۔۔ سر ۔۔۔!" حوالدار نے سر جھکا کر کہا۔ پھر میری طرف مڑ کر بولا۔
"چلو۔"

میں حوالدار کے پیچھے باہر نکل آیا۔ حوالدار نے اُسی موٹے کانسٹبل کو مخاطب
کرتے ہوئے کہا۔

"پانڈے صاحب! بڑے صاحب نے اس آدمی کی کمپلین لاج کرنے کو کہا ہے۔"
پانڈے نے خشونت آمیز نظروں سے میری طرف دیکھا۔ چڑچڑاہٹ اور بیزاری
اُس کے چہرے سے صاف پڑھی جا سکتی تھی۔ ایک لمحے کو اُس کی اور میری نظریں ملیں۔
میں نے دھیرے سے کہا۔

"نہیں مجھے کوئی کمپلین نہیں لکھوانی ہے۔"

اتنا کہہ کر میں تیزی سے دروازے کے باہر نکل گیا۔ اپنے پیچھے میں نے پانڈے
کی آواز سُنی جو شاید بھالے راؤ سے کہہ رہا تھا۔

"ذرا اِن کا حلیہ تو دیکھو۔ دَم تو کچھ بھی نہیں اور چلے ہیں دادا لوگوں سے ٹکّر لینے۔"

میں تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا پولیس اسٹیشن کے باہر نکل آیا۔ کلائی کی گھڑی دیکھی، دس بج رہے تھے۔ دُکانیں قریب قریب بند ہو چکی تھیں۔ صرف 'نیو اسٹار' ہوٹل کھلا تھا اور پان والے کی دُکان پر کچھ لوگ کھڑے نظر آ رہے تھے۔ میں نے جیب سے دس پیسے کا ایک سکّہ نکالا اور پان والے سے ایک پناما سگریٹ خرید کر پاس ہی جلتے ہوئے چراغ سے اُسے سلگایا۔

میرے قدم پھر اپنے محلے کی طرف اُٹھ گئے۔ میں اُس وقت بالکل خالی الذہن ہو گیا تھا۔ نہ مجھے شامو پر غصّہ آ رہا تھا نہ پانڈے حوالدار پر نہ پولیس انسپکٹر پر۔ مجھے وہ تینوں ایک جیسے ہی لگے۔ انسپکٹر کی باتوں نے مجھے جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا سچائی، انصاف اور شرافت سب کتابی باتیں ہیں۔ حقیقی زندگی سے ان کا دُور کا بھی واسطہ نہیں۔ اس دنیا میں شریف اور ایمان دار آدمی کو لوگ اسی طرح نفرت وحقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ جس طرح کسی زمانے میں برہمن، شُدر لوگوں کو دیکھتے تھے۔ میں ریلوے پٹری کراس کر کے پتلی سڑک پر آ گیا تھا۔ نالیوں سے اُٹھنے والے بدبو کے بھبکوں نے میرا استقبال کیا۔ میں پھر اپنے محلے میں داخل ہو چکا تھا۔ سامنے شامو کے اڈے پر ویسی ہی چہل پہل تھی۔ سیخ کباب والے کی انگیٹھی برابر دہک رہی تھی اور گلاسوں کی کھنک اور پینے والوں کی بہکی بہکی گالیاں فضا میں تیرتی پھر رہی تھیں۔

میں ایک پل کے لیے ٹھٹکا۔ پھر اپنے گھر کی طرف مُڑنے کے بجائے شامو کے اڈّے کی طرف بڑھ گیا۔ قریب پہنچ کر میں نے اڈّے کا جائزہ لیا۔ پانچ دس آدمی بینچوں پر بیٹھے، سیخ کباب چکھتے، شراب کے گھونٹ لے رہے تھے۔ سوڈا واٹر

کی بوتلیں اور شراب کے گلاس اُن کے سامنے رکھے تھے ۔ دیسی شراب کی تیز بُو میرے نتھنوں سے ٹکرائی ۔ دو چھوکرے پینے والوں کو سرو کر رہے تھے ۔ اُن میں ایک وہی تھا جس نے مجھ پر چاقو اُٹھایا تھا ۔ میں جیسے ہی روشنی میں آیا ۔ اُس کی نظر مجھ پر پڑی ۔ ایک لمحے کے لیے وہ چونکا پھر اپنے ہاتھ میں دبی سوڈے کی بوتل دوسرے چھوکرے کے ہاتھ میں تھماتا ہوا دھیمی آواز میں کچھ بولا ۔ اُس چھوکرے نے بھی پلٹ کر مجھے دیکھا اور پھر لپک کر اندر کے کمرے میں چلا گیا ۔ مجھ پر چاقو اُٹھانے والا اپنی کمر پر دونوں ہاتھ رکھے اسی طرح کھڑا مجھے گھور رہا تھا ۔ میں دھیرے دھیرے چلتا ہوا قریب کی ایک بینچ پر جا کر بیٹھ گیا ۔ اتنے میں شامو لنگی اور بنیان پہنے باہر نکلا ۔ اُس کے ساتھ دو چھوکرے اور بھی تھے ۔ شامو کے تیور اچھّے نہیں تھے ۔

"کون ہے رے !" اُس نے تیکھے لہجے میں مجھ پر چاقو اُٹھانے والے چھوکرے سے پوچھا ۔ پھر اُس کے جواب دینے سے پہلے ہی اُس کی نظر مجھ پر پڑ گئی اور وہ بھی ایک لمحے کے لیے ٹھٹک گیا ۔ میری نظریں اُس کے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں ۔ اُس نے اُن چھوکروں سے کچھ کہا ۔ جسے میں نہیں سن سکا ۔ پھر وہ دھیرے دھیرے چلتا ہوا میرے قریب آ کر کھڑا ہو گیا ۔ دوسرے چھوکرے چند قدم کے فاصلے سے مجھے نیم دائرے کی شکل میں گھیرے کھڑے ہو گئے ۔ شراب پینے والے دوسرے گاہک بھی اب بہکی بہکی باتیں کرنے کی بجائے ہماری طرف دیکھنے لگے تھے ۔ شاید وہ بھی سمجھ گئے تھے کہ اب یہاں کچھ ہونے والا ہے ۔ میں اسی طرح بینچ پر بیٹھا شامو کی طرف دیکھ رہا تھا ۔ شامو نے اپنی لنگی اُوپر چڑھاتے ہوئے کڑے لہجے میں پوچھا ۔

"اب کیا ہے ؟"

معاً اُس کی اور میری نظریں ملیں ۔ اُس کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں ۔ میں نے نہایت پُرسکون لہجے میں جواب دیا ۔

"پاؤ سیر موسمبی اور ایک سادا سوڈا۔"

شامو کے ہاتھ سے ٹنگی کے چھور چھوٹ گئے اور وہ حیرت سے میری طرف دیکھنے لگا۔

نیم دائرے کی شکل میں کھڑے اُس کے چھوکرے بھی حیران نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ اُن کے لیے میرا یہ رویہ شاید قطعی غیر متوقع تھا۔ وہ سب پتھر کی مورتیوں کی طرح بے حس و حرکت کھڑے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ اُن کی آنکھوں میں اس وقت ایک عجیب قسم کی پریشانی جھلک رہی تھی۔ چند ثانیوں کے لیے ہی کیوں نہ ہو۔ اُس وقت وہ مجھے بہت بے بس نظر آئے اور ان کی اُس بے بسی کو دیکھ کر مجھے اندر سے بڑی راحت کا احساس ہوا۔ چند سیکنڈ تک کوئی کچھ نہ بولا۔ میں نے اُسی ٹھہرے ہوئے لہجے میں آگے کہا۔

"اور ایک پلیٹ بھنی ہوئی کلیجی بھی دینا۔"

۶ ستمبر ۱۹۷۴

پرنٹر پبلشر زاہدہ سلام نے، نیو رائٹرس پبلی کیشنز کے لیے پراماؤنٹ آفسیٹ پریس، ۱۳، میونسپل انڈسٹریل ایسٹیٹ، ۴۲ ایف، کلارک روڈ، جیکب سرکل، بمبئی ۱۱ میں چھپوا کر ۲۸/۳۴ بی قریش نگر، کرلا سے شائع کیا۔
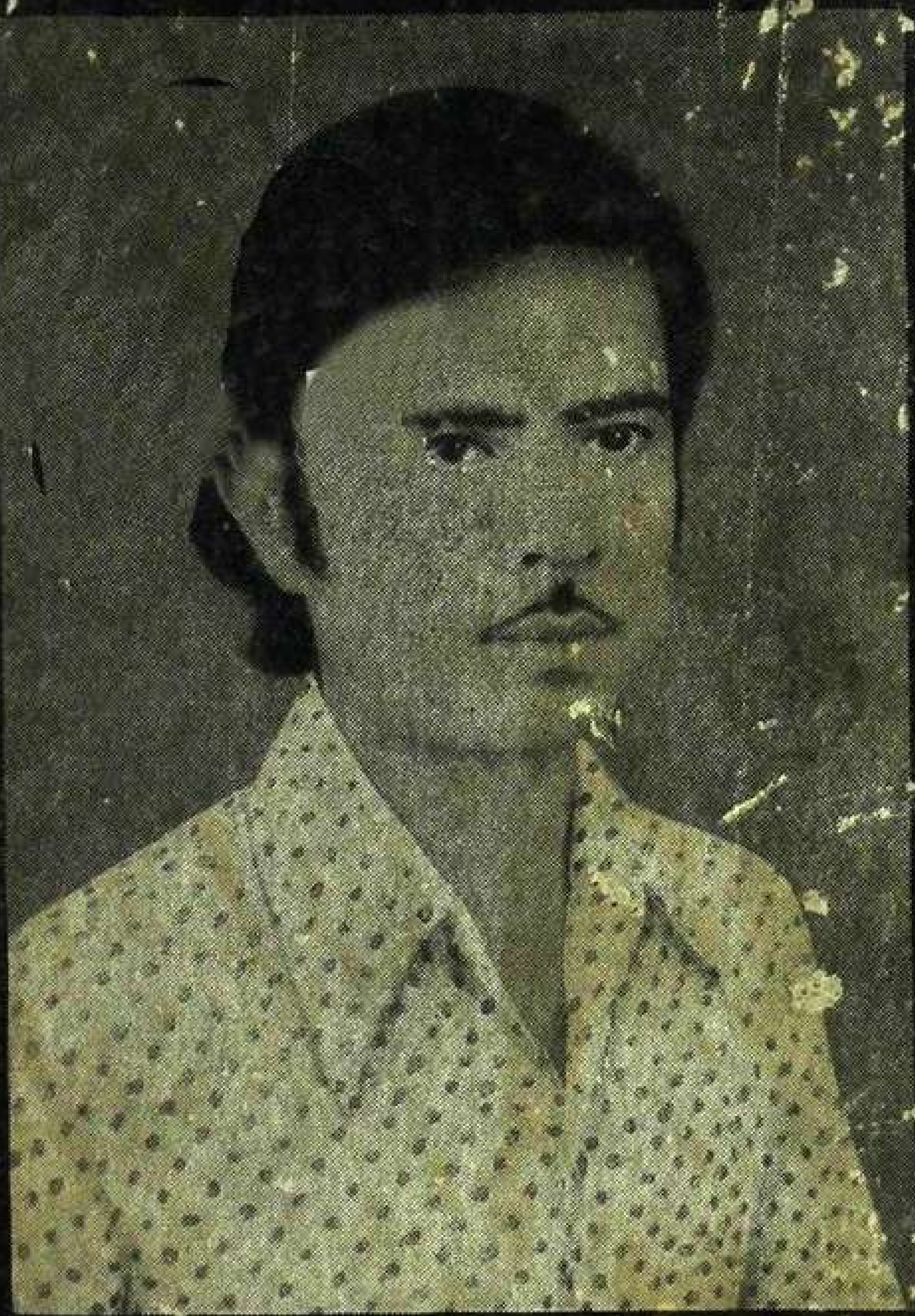
نیو رائٹرس پبلی کیشنز کی یہ تیسری کتاب، سلام بن رزاق کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے۔ اس مجموعے میں ان کے منتخب افسانے شامل ہیں۔

سلام بن رزاق اردو، ہندی کے جانے پہچانے افسانہ نگار ہیں۔ ان کی یہ تخلیقات ہند و پاک کے معیاری رسائل میں شائع ہو چکی ہیں اور اب انھیں پہلی بار کتابی صورت میں پیش کرنے کا فخر نیو رائٹرس پبلی کیشنز کو حاصل ہے

ادارہ